DASTAVEEZ

1984-85

VOL-II

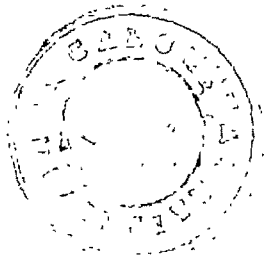

Department of Urdu, University of Calcutta.

Printed at :
NEW ASIAN PRINTERS, 29/7, Phears Lane, Cal.-73, Office : 27-1647

Rs. 15.00

اخلاق سے بحث نہ ہو۔ میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر مرزا قتیل کے شاگرد ہیں۔ وہ مرزا کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں میں۔ غالب کا خود خیال تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی کا چرچا ہوا، دو شاعر ہوئے ایک غالب اور دوسرا خسرو۔ . . . . . نکات غالب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو اور کسی مضمون سے خبر ہی نہیں۔ اگر کوئی لڑکا بھی خان آرزو کی تصنیفات پر ایک نظر سرسری ڈالے تو اس کو مرزا کے نکات سے دس گونے زیادہ نکتے یاد ہو جائیں۔ [1]

اس سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عہد غالب کی ایک اہم شخصیت یعنی مورخ غالب کا مداح نہیں ناقد تھا۔ مگر ان کی تنقید کی فینچی غالب کے جامۂ ہستی کی دھجیاں بکھیر رہی ہے وہ ان کی فنی خوبی کو قطع نہ کر سکی۔ کیونکہ ان کے پہلے جملے "مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی"۔ — یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہزار برائیوں کے باوجود غالب نے اپنی قادر الکلامی کا لوہا اپنے عہد کے مورخ ناقد سے منوا لیا تھا۔

غالب کے فن کے متعلق جناب صباح کا قول ہے کہ "شاعری اور خصوصاً ریختہ سے انکی بے زاری کے باوجود ان کے معاصرین اور پھر ان کے تلامذہ آخر آخر وقت تک ان کے بڑے مداح اور قدر داں رہے" [2]

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ غالب کے مدح خواں صرف ہمارے عہد میں نہیں بلکہ عہد غالب میں بھی انکے ناقدین کے مقابلے میں سہ گنا تھے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس عہد میں بھی مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت مسلم تھی اور معاصرین غالب انکے فنی وقار کے مرتبہ شناس تھے۔ اور انہوں نے اقلیم سخن کے اس تاجدار کو قرار واقعی خراج تحسین بھی ادا کیا ہے۔

---

[1] ۔ [2] صباح الدین عبدالرحمٰن "مرزا غالب مدح و قدح کی روشنی میں" صفحہ ۶۲-۶۱
[2] " " " " " صفحہ ۴۰

ناقدین ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں تنقید کا فرض نہیں ادا کر دیا ہے۔ کیونکہ تنقید کا فن بڑے ریاض اور خلوص کا طلب گار ہوتا ہے لہذا جب تک ایک نقاد اپنے فن سے خلوص پیدا نہ کر سکے اس وقت تک اس کی بات میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان دونوں ارباب نقد کا یہ بہت بڑا وصف ہے کہ انہوں نے فن اور فن کار دونوں کی عظمت سے کما حقہٗ اپنی واقفیت بہم پہنچائی اور جب محاکمہ قائم کیا تو فن نقد میں اپنا وقیع اور لافانی نقش چھوڑ گئے۔ مگر ان دونوں باکمالوں کی تصانیف غالب کی وفات کے بعد منظر عام پر آئیں۔ بہرکیف انکی تصانیف غالب کے عہد میں نہ تھیں تو کیا ہوا انکی ذات تو موجود تھی۔ وہ معاصر تھے اور معاصر ناقدین کی فہرست مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ جب تک کہ ان ناقدین کے زمرے میں ان دونوں اہل نقد کی شمولیت کو لازمی قرار نہ دیا جائے۔

اب رہی مولوی ذکاء اللہ کی رائے تو ان کی رائے تنقید نہیں تنقیص پر مبنی ہے۔ مولوی ذکاء اللہ ایک مورخ کی حیثیت سے عہد غالب میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں مگر یہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا کمال ہے کہ اس نے اپنے عہد کے مؤرخ ناقد سے بھی اپنی قادرالکلامی کا لوہا منوا کر چھوڑا۔ اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ جناب صباح نے اپنی کتاب میں مولوی ذکاء اللہ کے نظریات کا بہ نظر غائر جائزہ لیا ہے اور ان سے متعلق مکمل تفصیل یوں پیش کی ہے۔

"مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سنگدل ایسا تھا کہ سارے بھائی بہنوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مر گئے تو خوش ہو ہو کے کہتا تھا کہ بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائی شعر کہنا کیا جانے نہ اس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھوں سے جوتیاں کھائیں۔ نہ جیل خانے میں جانا پڑا۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس جگہ بیچتا تھا۔ اسلئے قصائد میں یہ نہیں لکھتا تھا کہ کس کی تعریف میں ہے۔ بلکہ ان پر نمبر لگا دیئے ہیں۔ سیزدہم، دہم، نہم، میرے نزدیک فقط اسکی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ فضائل اور

ان سات تذکروں میں سے چھ تذکرے مرزا غالب کی مدح سرائی کے آئینہ دار ہیں صرف ایک تذکرۂ گلستانِ بے خزاں " قدح پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں معاصرین غالب کے دیگر تذکرے جو مرزا غالب کی وفات کے بعد منظر عام پر آئے وہ بھی غالب کی مدحت طرازی کا بیّن ثبوت ہیں۔ مثلاً

۱۔ سخن شعراء ۱۸۷۵ء مؤلفہ عبدالغفور نساخ

۲۔ آبِ حیات ۱۸۸۳ء " مولانا محمد حسین آزاد

۳۔ جلوۂ خضر دو جلد ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۰ء " فرزند احمد صغیر بلگرامی

۴۔ تذکرۂ غوثیہ[1] " حضرت غوث علی شاہ قلندر مرتبہ شاخ گل

دہلی اور آگرے کے بعد سرزمین بنگال جس کے سحر نے غالب کو اس حد تک مسحور کر دیا کہ انہوں نے یہاں کی خاک نشینی کو اور جگہوں کی حکمرانی سے بہتر تصور کیا۔ خصوصاً کلکتہ جس کا ذکر ہی ان کے دل پر نشتر زنی کے مترادف ہو گیا اور وہ ان کے نام کے ساتھ ہی ہائے ہائے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سحر آفریں مقام میں بھی غالب کے پانچ ناقدین بلکہ مخالفین پیدا ہو گئے احمد علی اصفہانی، احمد علی گویاموی، افضل بیگ، وجاہت علی اور عبدالقادر رامپوری جنہوں نے ان کے فنی وقار پر ہی ضرب نہیں لگائی۔ بلکہ انکی شخصیت کو بھی مسخ کر ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ جب ہم غالب کے معاصر ناقدین کی آراء کا تجزیہ کرتے ہیں تو منصفانہ شعور اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زیادہ تر اصحابِ نقد نے ذاتیات پر حملے کئے ہیں۔ کلام سے بحث نہیں کی اور جنہوں نے کلام سے بحث کی ہے انہوں نے بھی انتقادی جذبے سے مغلوب ہو کر ناقدین کے بجائے مخالفین کا رول ادا کیا۔ حالانکہ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ ذات و شخصیت سے قطع نظر کر کے اور تحسین و تنقیص سے بالاتر ہو کر کلام پر محاکمہ قائم کیا جاتا تو حقیقت خود بے نقاب ہو جاتی اور فن کار کا پوشیدہ جوہر کھل کر سامنے آجاتا مگر اسے کیا کیجئے "، قدر گوہر شاہ بداند یا بداند جوہری " اب رہے مولانا حالی اور مولانا آزاد تو ان دونوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات عہدِ غالب کے وہ مایہ ناز

---

[1] تذکرۂ غوثیہ ۱۸۷۹ء میں شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے مرید گل حسن نے مرتب کر کے شائع کیا۔ اسلئے اس کا سن تالیف معلوم نہ ہو سکا۔ ط۔ ص

ایام صبا سے یہ برکت انفاس میسر کہ ان استادوں کے بمرتبہ علم پہنچے۔ تب ان کی فکر رسا نے یہ رسا دکھائی۔ کیوں نہ خوش گو ہوں جنکے ایسے استاد دو ہوں، متانت فحوائے کلام میں لاکلام، کلام سے بنیاد سخن کو استحکام، چونکہ وہ استاد مرگئے، یہ جد دہلی سے ادھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں، ہاں خود استاد ہیں۔ مرغان مضامین کے صیاد ہیں۔ ہاں ان کا فراخ حوصلہ ہے پھر تبحر کا کیا گلہ ہے گو فارسی میں متین ہیں پر اردو میں تو ذوق ہی نکتہ چیں ہیں۔ اب بعد وفات ذوق ان کو شاعری میں کمال ہو، کلام ان کا سحر حلال ہو مگر زمانہ خالی نہیں، کیا اور کسی کی طبیعت عالی نہیں، غالباً جو کسی سے مقابلہ ہو تو حاکمانہ محکمۂ شعر کے روبرو معاملہ ہو۔ (گلستان بے خزاں ۱۸۵۰ء)

اوپر کے اقتباس میں تذکرہ نویس ادبی تنقیدیں کرنے کے بجائے انتقامی جذبہ سے مغلوب نظر آتا ہے۔ تنقید پر تنقیص غالب آگئی ہے۔ یہ عبارتیں غالب اور ان کے مداحوں کی نظروں سے ضرور گذری ہوں گی۔ وہ چیں بہ جبیں ضرور ہوئے ہوں گے۔ غالب شاید اسی کے بعد زمانہ میں اپنی ناقدری کے شاکی ہوئے ہوں گے کہ لوگوں نے ان کے مرتبے کو بقدر بایست نہیں پہچانا۔ لیکن اس حملے سے غالب کی بڑھتی ہوئی شہرت اور مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا[1]

مرزا غالب کی زندگی میں سات تذکرے منظر عام پر آئے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عمدۂ منتخبہ ۱۲-۱۸۰۱ء مؤلفہ میر محمد خاں سرور
۲۔ گلشن بے خار ۱۸۳۴ء ؍؍ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و حسرتی
۳۔ گلدستۂ نازنینات ۱۸۴۵ء ؍؍ مولوی کریم الدین
۴۔ آثار الصنادید ۱۸۴۵ء ؍؍ سر سید احمد خاں
۵۔ طبقات الشعرائے ہند ۱۸۴۷ء ؍؍ مولوی کریم الدین
۶۔ گلستانِ بے خزاں ۱۸۵۰ء ؍؍ قطب الدین باطن
۷۔ گلستانِ سخن ۱۸۵۴ء ؍؍ مرزا قادر صابر دہلوی

---

[1] صباح الدین عبدالرحمٰن مرزا غالب، مدح و قدح کی روشنی میں، ص ۵۹-۵۶

تو انہوں نے بھی حریف کو دندان شکن جواب دیکر اپنی استادی کا بھرم رکھ لیا۔ لیکن اصل حقیقت یوں ہے کہ ذوق غالب کے نکتہ چیں نہیں مداح تھے۔

یہ تمام واقعات تو غالب کی زندگی میں اور خاص شہر دہلی سے متعلق ہیں مگر غالب کے ناقدین کی فہرست یہیں سے تمام نہیں ہو جاتی بلکہ خود غالب کے مولد یعنی شہر اکبر آباد میں باطن جیسے زبردست مخالف موجود تھے۔ جنہوں نے نواب شیفتہ کے ہاتھوں اپنے استاد نظیر کی بے وقعتی کا انتقام بجائے شیفتہ تک محدود رکھنے کے شیفتہ کے تمام ممدوح شعرا کے ساتھ غالب سے بھی زبردست لیا اور انکی ذات و شخصیت کو ہدف ملامت بنانے کے علاوہ انکی شعری عظمت کو بھی مجروح کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ جناب صباح نے بھی اپنی کتاب میں اس طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ غالب کی زندگی میں انکی شاعری اور ذات پر سب سے زبردست حملہ نظیر اکبر آبادی کے ایک شاگرد قطب الدین باطن نے اپنے تذکرہ "گلستان بے خزاں" میں کیا، ۱۲۶۵ھ میں مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ شیفتہ کے تذکرہ "گلشن بے خار" کے جواب میں لکھا گیا جس میں شیفتہ نظیر اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"۔۔۔ اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیان جاری است و نظریات ابیات در اعداد شعرا، نشاید شمرد۔" (ص ۳۴۱)

قطب الدین باطن کو استاد پر یہ حملہ ناگوار گذرا، اس لئے انہوں نے "گلستان بے خزاں" لکھ کر شیفتہ کے تمام ممدوح شاعروں کی خبر اچھی طرح لی ہے۔ جن میں غالب بھی ہیں، اس کے علاوہ باطن ہی کی روایت کے مطابق غالب نے اپنی زندگی میں نظیر اکبر آبادی سے بھی تعلیم پائی۔ لیکن آگے چل کر غالب نظیر اکبر آبادی کی شاگردی کے معترف نہیں رہے، باطن کو اس سے بھی ناگواری تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے تذکرہ میں غالب سے بڑی برہمی کا اظہار کیا۔ [1]

"غالب و اسد تخلص اسد اللہ خاں نام ملقب بمرزا نوشہ آپ دو تخلص کرتے ہیں کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں از نبائر غلام حسین کمیدان قبل اس سے جو دہلی، آگرہ میں انکی سکونت کا مکان، استادان باشعور کے محفل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی شعرا، نظیر جو بے نظیر روزگار تھے جن سے تعلیم پائی

---

[1] صباح الدین عبدالرحمٰن، "مرزا غالب مدح و قدح کی روشنی میں" ص ۵۶-۵۵

مولانا آزاد غالب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سخن کا بھی بادشاہ تھا۔ اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دیدیا[1]

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

شیخ ابراہیم ذوق دراصل غالب کے ناقد تھے یا مداح۔ اس حقیقت کا انکشاف ذوق بیان سے بخوبی ہو چکا ہے۔ مگر اس زمانے میں جبکہ دونوں استادان فن بقید حیات تھے اور انکی ملک کا شہرہ عام تھا۔ ذوق دہلی کے باشندے اور بادشاہ وقت کے استاد تھے اور پھر عہد غالب میں انکی عظمت کا سکہ عوام و خاص سب کے دلوں پر رائج تھا یعنی انہیں قبول عام سند حاصل تھی۔ اور غالب سچ پوچھئے تو ذوق سے ہی نہیں بلکہ اپنے تمام معاصرین سے زیادہ دوراکلام تھے۔ وہ نابغۂ عصر تھے مگر ان کا ذہن جو اس عہد ہی کا ترجمان نہیں بلکہ مستقبل کی بھی ایک صدی کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس کا عہد اسکی اعلیٰ فراست کا احاطہ نہ کر سکا نتیجہ یہ ہے کہ ذوق کو ہمہ گیر شہرت حاصل ہو گئی اور اپنے عہد کا عظیم ترین فنکار قدر شناسی کا شکار ہو گیا۔ ذوق پُرگو تھے اور اپنی پُرگوئی پر نازاں بھی۔ مگر غالب کا تو کہنا نہ بانکپن کب سامنے رہنے والا تھا۔ انہوں نے حریف کے سارے کس بل نکال کر رکھدیئے۔ ملاحظہ ہوں

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ
کہ بود پرگوئی فلاں در سخن ہم سنگ من است
نیست نقصاں یک دو جز است سواد رخ سخن
کاد زم برگے ز نخلستان فرہنگ من است

مگر آفریں ہے ذوق کی اعلیٰ ظرفی اور جوہر شناسی کی کہ انہوں نے غالب کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے بھی اسکی قدردانی کا برملا اظہار کیا اور اس کے شعری محاسن کے معترف رہے مگر جب غالب نے سہرے کے مقطع میں خود ہی ذوق کو للکارا ؎ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد "آب حیات" ۶۰۶

غالبؔ کو مخاطب کرکے یہ قطعہ پڑھا ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے!
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے [۱]

ان کے بعد عبداللہ خاں اوجؔ جو بذاتِ خود مہمل گو تھے، انہوں نے غالبؔ کو متنبہ کیا۔

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آساں نہیں صاحبِ دیواں ہونا [۲]

پھر مولوی عبدالقادر رامپوری نے ایک مہمل شعر کو غالبؔ سے منسوب کرکے اس کے معنی ان سے دریافت کئے۔ اور اس طرح ان کے سخن کو بے معنی اور بے وقعت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کی تفصیل مولانا حالیؔ نے یوں پیش کی ہے۔

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو چند روز قطعۂ دہلی سے تعلق رہا تھا مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے مرزا کے سامنے پڑھے۔

؎ پہلے تو رو عنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب بھی دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں [۳]

---

[۱] صباح الدین عبدالرحمٰن "مرزا غالب۔ مدح و قدح کی روشنی میں" ص ۵۳
[۲] مولانا محمد حسین آزاد "آبِ حیات" ص ۶۰۸ (حاشیہ پر)
[۳] مولانا الطاف حسین حالیؔ "یادگارِ غالب" ص ۱۰۹ - ۱۰۸

ایراں کو عہدِ غالبؔ عالی جناب میں!
تاب مقاومت نہیں ہندوستاں کے ساتھ

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "ہر عملے را خارِ باشد ہمنشیں" گلاب کانٹوں ہی میں کھلتا ہے۔ لہٰذا غالبؔ کو بھی صرف خوبیوں کا مجسمہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ اپنی شخصی کمزوریوں کی طرف خود ہی انگشت نمائی کر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی خامیوں کا اپنے خطوط میں بھی برملا اظہار کیا ہے۔ جب وہ بقیدِ حیات تھے تو پارسائوں کی نظر میں انکی شخصیت ہدفِ ملامت تھی اور مشاعرے کی محفلوں میں انکی شاعری، غالبؔ کا قول تھا کہ وہ ع ہے دلی پوشیدہ اور کافر کھلا

اب خواہ وہ خود کو دلی ہی کیوں نہ تصور کر لیں لیکن وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ زمانہ انہیں کھلا کافر ہی سمجھ رہا ہے۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنی شخصی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے بجائے اس کا اعلانیہ اعتراف کیا۔ اوروں سے پہلے انہوں نے اپنی ہنسی خود اڑائی اپنی ذات کو ابتدا میں طنز و مزاح کا نشانہ بنانے والے بھی وہ خود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کے ناقدین نے انہیں تیرِ تنقید کا نشانہ بنایا تو وہ ہراساں نہ ہوئے۔ وہ ہراساں ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ عظیم شخصیتیں کبھی ہراساں نہیں ہوتیں بلکہ ہر مشکل کو آسان کر لیتی ہیں۔ غالبؔ کی شخصیت کا اصلی جوہر استحکام تھا۔ استواری تھی۔ وہ مضبوط انفرادیت کے حامل تھے۔ انکی طبیعت کی شگفتگی اور بذلہ سنجی نے ایک کثیر تعداد کو ان کا شیدائی بنا دیا تو مزاج کے تیکھے پن نے ایک بڑی جماعت کو ان کے مخالفین کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ان مخالفین کے زمرے میں ہم ناقدین کو بھی شامل کئے لیتے ہیں۔ یہ مخالفین بھی دو طرح کے تھے۔ بعض انکی شخصیت سے متنفر تھے اور بعض ان کے کلام کے شاکی۔ لیکن یہاں ہمارے موضوعِ بحث وہ ناقدین ہیں جنہوں نے ان کے کلام سے بحث کی ہے اور ان پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

عہدِ غالبؔ میں جب ہم غالبؔ کے ناقدین کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو بارہ اصحاب نقد و نظر کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ آغا جان عیشؔ جنہوں نے اجمیری دروازے کے مشاعرے میں غالبؔ کو اپنے تیرِ تنقید کا نشانہ بنایا، جناب صباح کی روایت ہے ۔ غالبؔ کے معاصروں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو انکی مشکل گوئی کو پسند نہیں کرتے تھے اور انکو چھیڑا کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ مرزا کسی مشاعرے میں موجود تھے انہوں نے اپنی طرحی غزل میں

— شیخ ابراہیم ذوق

"مولانا آزاد کی روایت ہے کہ ایک دن استاد مرحوم سے مرزا صاحب کے انداز نازک خیالی اور فارسی ترکیبوں اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا کہ بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا خوب پھر کہا جو مرزا کا شعر ہوتا ہے اسکی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر ان کے میں تمہیں سناتا ہوں، کئی متفرق شعر پڑھے تھے، ایک ابتک خیال میں ہے ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا[1]

— غلام علی وحشت مولانا حالی فرماتے ہیں:-

"غلام علی وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو دوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا۔ اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا"[2]

— ہرگوپال تفتہ۔ مرزا تفتہ نے اپنی منظوم کتاب "تضمین گلستان" میں غالب کی مدح سرائی اس طرح کی ہے :-

خدائے میرزا غالب دل و جاں گدائے میرزا غالب دل و جاں

چہ غالب ہم نوائے قیصر و جم چہ غالب میرزائے قیصر و جم!

بہ اہل فارس غالب غالب ما بہ از عرفی و طالب غالب ما

— منشی بال مکند بے صبر نے اپنے قصیدہ "درد دل" میں غالب کی مدح سرائی یوں کی ہے۔

سودا و میر مصحفی و جرأت اور درد! مجھ کو نہیں ہے کام ان رفتگان کے ساتھ

ممنون و مہجور و آتش و ناسخ و نصیر و ذوق کچھ واسطہ نہیں ہے ان اہل زباں کے ساتھ

غالب ہے غالب شعرا کا مرے لقب رشتہ تلامذہ کا ہے اس نکتہ داں کے ساتھ

اس شاہ ملک نظم سے مجھ کو مشورہ مثل بزرجمہر ہوں نوشیرواں کے ساتھ

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد "آب حیات" ص ۶۰۸ — ۶۰۷

[2] مولانا الطاف حسین حالی "یادگار غالب" ص ۔ ۱۹۳

مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ انہوں نے کچھ بیان کئے۔ اس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا: "آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں۔ آج انہوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کئے اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اس کے معنی کہے تھے، بیان کئے۔ مولانا نے فرمایا کہ پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟ اس نے کہا برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں مولانا نے کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لئے جو مرزا نے سمجھے تھے تو اس نے سخت غلطی کی۔

(مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۹۲)

ـــــ مفتی صدر الدین آزردہ[1]

ایک روز منشی بہاری لال مشتاق اپنے دوست لالہ رام چندر قمر کے ساتھ جناب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شعر و شاعری کا ذکر چلا۔ قمر نے غالب کی نکتہ سنجی اور نازک خیالی کی بہت تعریف کی۔ مولانا نے چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا کہ نہایت مشکل کہنا ہے اور پھر زانو پر ہاتھ مار کر شگفتہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ ہائے کہنا تو ایسا کہنا ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ـــــ مومن خاں مومن نے جب غالب کا یہ مقطع سنا ؎

تو بدیں شیوۂ گفتار نے داری غالب
گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانی

تو اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں، مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے[2]

---

[1] عبدالرحمٰن بجنوری، "مغنی صدر الدین آزردہ"، ص ۵۲-۵۳

[2] مولانا الطاف حسین حالی، "یادگار غالب"، ص ۱۹۲

— حضرت سید علی غمگین دھلوی فرماتے ہیں "چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فن سخنوری میں یکتائے زمانہ کیا ہے لہٰذا آپ میرے دیوان کو اول سے آخر تک دیکھیں۔ آپ تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں تو میری اس عرض کو ضرور قبول کریں۔ یہاں میرے ہم نشینوں میں کسی کو اتنی جرأت نہیں کہ میری اغلاط پر مجھے مطلع کریں۔ آپ کو علم تصوف جو دستگاہ ہے جس کا اظہار آپ کے خطوط سے ہوا۔ وہ علمائے ظاہر کو بھی نہیں ہے۔ آئندہ سے مسائل تصوف کو ملاقات پر موقوف رکھئے، مجھے آپ کا آزاد رویہ بہت پسند ہے۔ اسی لئے میں آپ کی ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ اگر ایسا شاہ باز ہاتھ آجائے تو پھر سوائے عنقا کے شکار کے کسی طرف توجہ نہ کرے گا۔ میں آپ کے طریقے سے بہت خوش ہوں۔ خدائے تعالیٰ آپ کی بزرگی میں ترقی دے۔ جب مجھ سے ملاقات ہوگی تو میں بھی اس کی تائید کروں گا۔ یہ طریقہ میرا پسندیدہ ہے۔" (مکتوب)

— منشی غلام غوث بیخبر لکھتے ہیں:۔

"حضرت خدا گواہ اور محبت شاہد ہے کہ ہمیشہ آپکے خطوں کیلئے اپنا جی تڑپایا کیا۔ اکثر آپ کو یہ لکھنا چاہا کہ جب تک زندہ ہوں مجھ سے تو سلسلۂ تحریر منقطع نہ کیجئے۔ اس محبت کی تادم آخر نباہ دیجئے لیکن آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر بعضوں سے یہ سنا کہ اب آپ نے اپنے حدام سے فرمایا ہے کہ کسی کا خط ہو مجھے دکھایا ہی نہ کرو۔ اس سبب سے تحریر پر جرأت نہ کر سکا۔ دل پر جبر کر کے بیٹھ رہا۔ اب جو آپ کا عنایت نامہ آیا، نہیں کہہ سکتا کہ کیسی خوشی ہوئی۔ ان چند سطروں کو بار بار پڑھا کیا۔ دیر تک ایک کیفیت قلب پر طاری رہی جو بیان میں نہیں آسکتی جو بیان میں نہیں آسکتی۔ اگر اتنا بھی معلوم ہو کہ میرے خط کا ایک جواب آئے گا تو حضرت کے دیوان خانہ کا طاقچہ میرے خطوں سے بھر جائے گا۔" (مکتوب)

— مولانا فضل حق

"مولانا فضل حق باایں ہمہ علم و فضل مرزا کو جس رتبے کا شاعر مانتے تھے اس کا اندازہ حکایت ذیل سے ہو سکتا ہے:۔

پیدا نہ ہوا۔ اول امیر خسرو۔ دوم حسن دہلوی، سوم مرزا بیدل، چہارم غالب
اگرچہ ناصر علی سہرندی اور مرزا مظہر جان جاناں اور غنی کشمیری اور خان آرزو
اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین
فریاد۔ یہ سب کے سب خوش گو اور شاعر بے بدل تھے۔ مگر جامۂ ایجاد جو خداداد ہے
ان ہی چاروں کے راست قامت پہ راست آیا۔ اور ان چاروں کے سوا جن کے
نام لکھے گئے ہیں۔ ان پر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا۔ گو ان کے سوا اور بھی
شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں
پاتے اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ تو خدا
کی دین ہے۔

(جلوۂ خضر ۹-۱۸۸۵ء)

—— حضرت غوث علی شاہ فرماتے ہیں :-

نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجۂ غایت
اور خلیق از حد تھے۔ رند مشرب۔ بے شر، حمدل تھے۔ اور فن شاعری میں تو اپنا
جواب نہ رکھتے تھے۔

(تذکرۂ غوثیہ)

—— مولانا الطاف حسین حالی کی روایت ہے :-

"مرزا کی نثر اردو نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص
و عام نے بالاتفاق اس کو پسند کیا ہے۔ انہوں نے اردو خط و کتابت میں ایک
خاص طرز ایجاد کی ہے۔ جو تمام ملک میں معقول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی
بساط کے مطابق اسکی پیروی کی ہے۔ ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی
نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا
جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی
فلک سے نہیں اٹھا اور زمانے کا رخ بدلا ہوا ہے اسلئے آئندہ بھی یہ امید نہیں کہ قدیم
طرز کی شاعری انشاپردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوں گے"

(یادگار غالب ۹۷-۱۸۹۶ء)

حالانکہ نثر اردو اوروں کی فارسی سے ہزار درجے بہتر ہے۔ اسے بھی ترتیب دیجئے"

(دیباچہ خود ہندی ۱۸۶۸ء)

—— عبدالغفور نساخ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

مخدوم اعظم نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ معروف بہ مرزا نوشہ خلف عبداللہ بیگ خاں اولاد میں افراسیاب کے ہیں۔ مولداً اکبرآباد و مسکن دہلی طبیعت انکی بہت دشوار پسند ہے۔ اشعار فارسی ان کے اشعار ظہوری ترشیزی اور مرزا عبدالقادر بیدل کے ہم پہلو ہوتے ہیں۔ اشعار اردو میں بھی وہی انداز ہے، اوائل میں اردو غزلوں میں اسد تخلص کرتے تھے۔ بڑا عرصہ گذرا کہ کلکتہ میں بھی آئے تھے۔ راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام انکی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ کلیات ان کا نظر سے گذرا۔ ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔

سخن شعرا ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء

—— مولانا محمد حسین آزاد کی روایت ہے۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مگر علوم درسی کی تکمیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی۔ اور حق پوچھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجۂ کمال تک پہنچائے وہ کیسی طبع خداداد لایا ہوگا۔ جس نے اسکی فکر میں یہ بلند پروازی، دماغ میں یہ معنی آفرینی، خیالات میں ایسا انداز، لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی"

(آب حیات ۱۸۸۳ء)

—— فرزند احمد صغیر بلگرامی اپنے تذکرہ میں یوں رطب اللسان ہیں :-

"اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ اکبرآبادی مولداً دہلی مسکن المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولایتی فارسی کا یقیناً چار شخصوں کے کلام

— خواجہ عزیز لکھنوی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں۔

"مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا۔ ایک بڑا پھاٹک، تھا جس کے بغل میں ایک کمرہ اور کمرہ میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف البتہ آدمی گندمی رنگ، اسّی، بیاسی ۸۲ برس ضعیف العمر لیٹا ہوا، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے ہوئے آنکھیں گڑوے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالبؔ دہلوی ہیں جو بگمانِ غالب دیوان قاآنی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ہم نے سلام کیا۔۔۔۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ۔ ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کئے۔"

(سفرنامہ ۱۸۶۳ء)

— عبدالغفور سرور کی روایت ہے۔

"مخدومی و استاذی نجم الدولہ دبیر الملک محمد اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ کو وہ قدرتِ سخن سنجی اور معنی آفرینی عطا فرمائی ہے کہ تمام عالم انکی ہمہ دانی کا قائل اور شیوہ بیانی کا مائل ہے۔ نظم میں وہ پایہ بلند کہ شعرائے ان کے ہر شعر پر لالی انجم تصدقے اتارے۔ خود بلاگردان ہو لولی سماعروس ہر مصرعہ دل وجان وارے صدقہ و قربان ہو، ترکیب الفاظ اور ربط قوافی و ردیف کا عجب ڈھنگ ہے کہ سخنوران مسلم الثبوت کی عقل دنگ ہے۔ قافیہ تنگ ہے، عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اپنے کلام کی تصدیق چاہوں، اگر نظیری ہوتا، داد سخن دیتا، اعتقادات زمانہ سے ڈرتا ہوں ورنہ کہتا از انوئے سبق خوانی نہ کرتا۔ الحق موجد تازہ مضامین ہیں۔ اور آفرینندہ معانی دلنشیں ریختہ کا وہ انداز ریختہ خامہ سحر نگار ہے کہ میر کو زندہ کیا ہے، سودا کو مول لیا ہے۔ عبارت اردو باغ و بہار ہے۔

(دیباچہ عود ہندی ۱۸۶۸ء)

— منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ کا بیان ہے:۔

"مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو انکی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں مگر کلام اردو سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پایا۔

مرزا اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ کمال سخنوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اگر رودکی اس زمانے میں ہوتا تو اپنے دیوان کو رودِ اشک ندامت میں دھونا اگر آذری ان کے کلام کی زدوش دیکھتا تو آتش غیرت میں اپنی تصانیف کو جلا دیتا۔ حقیقت میں ان کا ہر مصرع مصرعہ ہلال آسمان سے بلند تر ہے۔"

(سفرنامہ ۱۸۵۲ء)

— مرزا قادر بخش صابر دہلوی اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں:-

"غالب تخلص شیرنیستان سخنوری ببر بیشۂ معنی پروری یکہ تاز عرصۂ کمال یگانہ کشور افضال سیاح زمین سخن دانائے نوادر فن زبدۂ کملائے جہان مرزا اسداللہ خاں معروف بمرزا نوشہ سلمہ الرحمٰن سخن سنج بے مثل و بے نظیر اور صاحب طرز دلپذیر بر خامہ گوہر بار سے اقلیم سخن میں سوائے جہانگیری بلند کیا ہے اور یوسف معنی کو اس ہجوم بدتمیزی میں زلیخا نشان مصر سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے فضائل اگر اس قدوہ افاضل کی ذات پر تکیہ نہ کرتے فضیلت نہ رکھتے اور کمالات اگر اس زبدۂ کملا سے مدد نہ لیتے عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے۔"

(گلستان سخن ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ)

— ریاض الدین امجد سندیلوی اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں۔

"مرزا غالب کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا۔ سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔ یہ سرآمد زبان دانائے شیراز و صفاہان ہیں، نفیس الطبع قدیم الوضع، والا تبار ناخدائے سفینۂ سخنوری اور یکتائے بحر معنی پروری، آسمان زمین ذی کمال، برزبان بام نازک خیالی، مجموعۂ اوراق خردمندی، شیرازۂ اجزائے جرائد معنی بندی، مہر سپہر بلاغت اسد بیشۂ فصاحت رشک انوری آرزوش طالب جق تو یہ ہے کہ شعرائے ماضی و حال ہر فن شاعری میں غالب"

(سرود ریاض ۱۸۶۱ء)

معروف بہ مرزا نوشہ رؤسائے قدیم اکبر آباد نیک بنیاد کے۔ مدت سے وارد شاہ جہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں کہ سبحان اللہ واہل مقابل اوج بلند خیالی اس کے حضیض جہل کا مبتلا مشہور سخن فہم و سخن داں اس پایہ پر کہ بتی دکھب باوجود تنہا اور بلند پائیگی کے مانند بچوں گھٹنیوں چلنے والے کے۔ ان کے حضور اشعار و مضامین آزادہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایا اس کے رشک دہ عبارت ظہوری خوان نعما اس کے سے، انوری ایک ادنی ازلہ بار حاقانی مستعد بہ سرد یا فیضی سے کیوں کر لوگ فیض کو نہ پہنچے جبکہ وہ اس کے ایک ادنی شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا۔"

(گلدستۂ نازنینان ۱۸۴۵ء)

اسد اللہ مشہور مرزا نوشہ رؤسائے قدیم سے ہیں۔ مہارت کتب فارسی کی انکو بہت ہے۔ اکثر آدمی شاہ جہاں آباد میں ان کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر بھی ان کا بہت اچھا ہے۔ ایک دیوان فارسی زبان کا انکی تصنیف ہے

(طبقات الشعرائے ہند ۱۸۴۷ء طبقہ چہارم)

—— سرسید احمد خاں یوں رقم طراز ہیں:-

راقم آثم کو جو اعتقاد انکی خدمت میں ہے ان کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔ ع والہا را بدلہا راہ باشد۔ آنحضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں

آثار الصنادید ۱۸۴۷ء

—— نواب غوث محمد خاں اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:-

"شاہ جہاں آباد میں شعرا بھی بہت ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز خوش بیانی اور طرز شیریں کلامی میں ہلالی و زلالی اور فیضی و عرفی ہے مگر

مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد، جوان قابل دیاباش و دردمند، ہمیشہ بہ خوش
عاشی بسر بردہ، ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر متمکن، عنہائے عشق مجاز تربیت
یافتہ خمکدۂ نیاز و فن سخن سنجی تتبع محاورات مرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمہ
و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند بالجملہ موجد طرز خوداست دبار اقم
رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد، اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ بہ مضامین
نازک موزوں گشتہ رویہ خیال بیش از بیش نہاد خاطر دارد۔" عمدۂ منتخبہ ۱۲-۱۸۰۱ء

— نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ وحسرتی کا بیان ہے۔

"طوطی بلند پرواز از چمن معانی است بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی
پیش بلندی خیالش اوج فلک پستی زمیں است و در جیب تہ نشینی
عنوانش سرفرازی قاروں کرسی نشین شاہین فکرش جز بشکار زندہ پرواز
و اشہب طبعش جز بعرصہ فلک بتازد۔"

(گلشن بے خار ۱۸۳۴ء)

— نواب ضیاء الدین احمد خاں تیرؔ رخشاںؔ نے غالب کے متعلق
یوں گوہر افشانی کی ہے:۔

ہمانا منتخب دیوان اردو زبانست ریختہ کلک مسیحی فرتاب خدام
فسطاس دانش و اسطرلاب بینش، جوہر آئینہ آفرینش معیار نقد گران مایگی
معراج سلم بلند پایگی قہرمان قلمرو معنی پروری، فرمان فرمائے گیہان سخن وری
گیتی خدائیگان نوآئین نگاری جہاں سالار تازہ گفتاری رواں بخشش
کالبد سخن گستری، بینائے فزائے چشم دیدہ وری فرازندہ نوائے شوکت خامہ
فروزندہ چراغ دودہ آمد آید ناسخ سہرت ہمداستاناں سرخیل انجمن نکتہ داناں

(تقریظ دیوانِ غالب ۱۸۴۱ء)

— مولوی کریم الدین پانی پتی غالبؔ کے متعلق مولوی صاحب کی مدحت
طرازی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اسد تخلص اسم شریف ان کا نواب اسداللہ خاں بہادر

صوبے دہلی، یوپی، بہار اور بنگال اس بات کے شاہد ہیں کہ غالب نوازی کا بھرپور ثبوت معاصرین غالب نے پیش کیا ہے۔ مثلاً دہلی میں میر محمد خاں سرور، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مفتی صدرالدین آزردہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر، رخشاں، سرسید احمد خاں، مولانا فضل حق، غلام علی وحشت، نواب غوث محمد خان، مومن خاں مومن، شیخ ابراہیم ذوق، قادر بخش صابر، محمد حسین آزاد اور مشہور صاحب باطن حضرت عمگین دہلوی یوپی میں منشی نبی بخش حقیر، غلام غوث بے خبر، ریاض الدین امجد سندیلوی، عبدالغفور سرور، ممتاز علی خاں میرٹھی اور عزیز لکھنوی، بہار میں حضرت غوث علی شاہ قلندر، باقر علی شاہ باقر بہاری، اور صفیر بلگرامی، بنگال میں عبدالغفور نساخ، کفایت خاں یزدانی سفیر، دلایت حسین، محمد حسن اور ولیم فریزر علاوہ بریں اردو کے پہلے سوانح نگار اور اولین باقاعدہ نقاد خواجہ الطاف حسین حالی، معروف تذکرہ نگار مولوی کریم الدین پانی پتی اور غالب کے ہندو شاگردوں میں مرزا تفتہ اور بے صبر سکندر آبادی نے غالب سے اپنی عقیدت اور محبت کا کھل کر اظہار کیا ہے اور ان تمام ارباب نقد و نظر نے بھی غالب کی شاعرانہ عظمت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اسکی تصدیق جناب صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اسداللہ خاں غالب کا دور اس لحاظ سے قابل قدر تھا کہ اسمیں بڑے بڑے اصحاب فن اور ارباب کمال کا اجتماع ہوگیا تھا، ان ہی میں میر محمد خاں سرور مخاطب بہ اعظم الدولہ بہادر معظم جنگ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین نیّر، رخشاں، سرسید احمد خاں، مولوی کریم الدین، مولوی امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ تھے، یہ سب ہی غالب کے فن کے معترف تھے۔" [1]

میر محمد خاں سرور اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"اسد تخلص، اسداللہ خان عرف مرزا نوشہ اصلش سمرقند،

---

[1] صباح الدین عبدالرحمٰن "مرزا غالب مدح و قدح کی روشنی میں" ص ۱

مرزا غالب

اپنے معاصرین کی نظر میں

از:- ڈاکٹر طیب صدیقہ۔ ایم۔ اے
(گولڈ میڈلسٹ) پی۔ ایچ۔ ڈی ریسرچ اسکالر کلکتہ یونیورسٹی

دنیائے شعر و سخن میں مرزا غالب کسی تعارف کے محتاج نہیں کیونکہ انکی شہرۂ آفاق مقبولیت زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے اور آج ان کی اس پیش گوئی کی تصدیق ہوگئی۔ ع

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

لیکن محض اس قدر کہہ دینے سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوجاتا بلکہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود انکے معاصرین کی نظر میں ان کا کیا مقام تھا؟ چنانچہ اس امر کی تحقیق کیلئے ہمیں عہد غالب کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور جب ہم حقیقت کا تجزیہ کرنے کیلئے عہد غالب کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو یہ جان کر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ ع

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

کہنے والے کی قدر و منزلت جس قدر انکی زندگی میں ان کے معاصرین نے کی ہے ان کے علاوہ وہ مقام و مناصب کسی صاحب فن کو تا حیات نصیب نہ ہوسکا۔ کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ عہد غالب میں غالب نوازوں کی ایک کثیر تعداد گو سارے عالم میں نہ سہی تو ہندوستان کے چند اہم صوبوں میں ضرور موجود تھی۔ ہندوستان کے چار مشہور ترین

فی الجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی فرائض کے تسلسل کا نام ہے ؎

وہ فرائض کا تسلسل ہے نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اسکی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

اگر عورتیں فرائض کی ادائیگی میں تغافل اور تساہل سے کام نہیں لیتی ہیں تو پھر ان کی مظلومی باقی نہیں رہتی۔ اپنے فرائض سے غافل ہو کر مردوں کی برابری کا نعرہ لگانا ایک احمقانہ فعل ہے "مرد اور عورت میں مساوات نہیں ہے" ـــــ اگر یہ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ کسی کو کسی پر برتری حاصل ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ اور ان کو جداگانہ صلاحیتیں تفویض کی گئی ہیں تاکہ وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر سکیں۔

مظلومیٔ نسواں پر اقبال کی غمناکی بجا سہی لیکن یہ کہنا کہ ؎

نہیں ممکن اس عقدۂ مشکل کی کشود

درست نہیں۔ اقبال ہی کے پیش کئے ہوئے نکات پر اگر عورتیں عمل کرنے لگیں اور اپنے آپ کو مردوں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش سے باز آجائیں تو ان کی مظلومی کا خاتمہ یقینی ہے۔ عورتوں کو مظلومی کا نشانہ فرائض سے غفلت اور کوتاہی برتنے کی بنا پر بننا پڑتا ہے

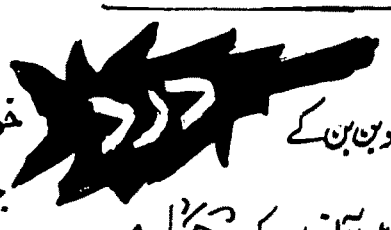

خواجہ وحید الحق عرشی
(مرحوم)
جن کا انتقال ۳ فروری ۱۹۸۶ء کو ہوا

جب کبھی آخر شب
چاند کا داغ ٹپکتا ہے لہو بن بن کے
جب کبھی بزمِ سحر
جھلملاتے ہیں کسی آنکھ میں آنسو بن کے
جب کبھی تپتی کرن
بوسے لیکے جھلس دیتی ہے لب کلیوں کے
تب
اسی وقت
بھٹکتا ہوا افتاں خیزاں
ایک انجانا سا درد آتا ہے
اور بن جاتا ہے احساس کے دامن کی شکن

کہیں نہ نیند کی وادی نہ خواب کے سائے
یہ راہ فکر کی کس دشت سے گذرتی ہے
اداس خواب بھٹکتے ہیں دور آنکھوں سے
تمام رات خیالوں کی دھول اڑتی ہے

★★

میر کے یہاں بھی حسن کی خصوصیات صرف انداز و ناز نہیں بلکہ حسن کی خصوصیات میں دلنوازی اور لطف زبان کو اولین مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔ اور یہ دونوں صفتیں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب حسن خود بینی کے احساس سے بے پروا ہو۔ ملاحظہ فرمائیے۔

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو
معشوق کاہے حسن اگر دلنواز ہو — میر

حسن تو تجھے ہی کر دلطفِ زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں — میر

گویا اقبال کے یہاں عورتوں کی تعلیم کیلئے غرورِ حسن سے سبکدوشی، امومت کے فرائض کی بجا آوری اور دینی تعلیم سے واقفیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو مشرقی ممالک سے خاص ہیں۔ لیکن مغرب کی تعلیم میں دین اور امومت کے فرائض کو نظر انداز کیا جانے لگا ہے۔ مشرق کی ان صفتوں کی بنا پر اقبال نے مشرقی خواتین کے بارے میں کہا ؎

میں نے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی

دراصل انسان دنیا میں صرف عمل کرنے کیلئے آتا ہے اور یہ اعمال اور فرائض نسل انسانی کے صرف ایک گروہ یعنی مردوں کے لئے نہیں ہیں بلکہ عورتوں کیلئے بھی ہیں۔ میری دانست میں عورتوں کی ذمہ داری مردوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے کیونکہ کبھی کبھی عورتوں کو گھر کے نظم و نسق اور امومت کے فرائض کی انجام دہی کے علاوہ معاشی طور پر بھی کفیل ہونا پڑتا ہے۔ حسن وہی ہے جو خود بینی کے احساس سے بے پروا ہو کر فرائض کی انجام پذیری میں مشغول رہے۔ اگر واقعی زندگی میں عمل کردار اور فرائض کی اہمیت نہیں ہوتی اور حسن ہی سب کچھ ہوتا، اور تسکین قلب و نظر ہی مقصود خاطر ہوتی تو پھر عورت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پتھر کے صنم عورت کے جیتے جاگتے مجسموں سے کہیں زیادہ خوبصورت دلکش، دل آویز اور پائیدار ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل زندگی سرتاپا کردار ہے ؎

زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت

بلکہ عورتوں کا گھر کی مرکزیت سے آزاد ہونا، امومت کے فرائض سے غافل ہو جانا اور دینی احکام سے لاپرواہ ہونا سماجی بدحالی کا سبب ضرور ہو سکتے ہیں۔

دین کے احکام اور امومت کے فرائض کو ضروری بتاتے ہوئے اقبال نے جس چیز کو عورتوں کے لئے غیر ضروری قرار دیا ہے وہ حسن کا احساس ہے۔ "غرورِ حسن" جو بالعموم عورتوں میں پایا جاتا ہے اس کو موت کے مترادف گردانتے ہیں ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازاں
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

کیونکہ "غرورِ حسن" فرائض کی بجا آوری میں خلل انداز ہوتا ہے۔ ورنہ حسن چیز کو اقبال نے سب سے زیادہ دل آویز شے قرار دیا ہے۔ لیکن وہ حسن جو خود بینی کے احساس سے بے پروا ہو تاکہ فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کا سبب نہ بن سکے۔ اقبال کا یہ خیال ملاحظہ فرمائیے۔

"خود بینی کے احساس سے بے پروا ایک بہت زیادہ خوبصورت عورت مجھے خدا کی سرزمین پر سب سے زیادہ دل آویز شے لگتی ہے"[1]

حسن بذاتِ خود بُرا نہیں یہ عطیۂ الٰہی ہے لیکن غرورِ حسن بے جا ہے کیونکہ یہ فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ نیز یہ کہ حسن فانی ہے اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا اصل چیز انسان کا اخلاق اور کردار ہے۔ اس کی جانب گہری توجہ مبذول کرنا چاہئے۔ لیکن بالعموم کردار اور اخلاق کی جانب سے غفلت برتی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ اقبال نے یہ نکتہ گوتم کی زبانی "جاوید نامہ" میں پیش کیا ہے ؎

حسنِ رخسار دمے ہست و دمے دیگر نیست
حسنِ کردار خیالاتِ خوشاں چیزے ہست

اقبال نے غرور سے عاری حسن کو سراہا ہے تو حسرت کو بھی اظہارِ تمنا کرنے پر حسن کے مغرور ہو جانے سے دکھ ہوتا ہے۔

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

---

[1] بکھرے خیالات مترجمہ ڈاکٹر عبدالحق صـ۱۵۲

میں تعلیم نسواں کے متعلق چند اشارے کئے ہیں اور عورتوں کی تعلیم میں جو باتیں ضروری خیال کی ہیں ان میں دین کی تعلیم اور امومت کے فرائض کو بہت ضروری قرار دیا ہے۔ اور ان دو صفتوں کے فقدان کو موت سے تعبیر کیا ہے۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کیلئے اس کا ثمر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن!
ہے عشق و محبت کیلئے علم و ہنر موت!

دراصل نسلوں کی بقا اور ترقی کا انحصار ماؤں پر ہے اور جو قوم اس حقیقت سے غافل ہو جاتی ہے۔ اس قوم کی ترقی کا سورج بہت جلد غروب ہو جاتا ہے ؎

جہاں را محکمی از امہات است
نہاد شاں امین ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے ندانند!
نظامِ کاروبارش بے ثبات است!

عورتوں کی بنیادی ذمہ داری گھر کا نظم و نسق، پرورش و تربیت اطفال ہے۔ عورتوں کے افکار کا مرکز گھر اور گھریلو امور ہیں تو مردوں کو کاروبار اور اس سے متعلق دیگر مسائل حل کرنا پڑتے ہیں۔ عورتوں کی معاشی جد وجہد میں دوڑ دھوپ کو اقبال ناپسند کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے:۔

"آئندہ سے عورتوں کو اپنے معاش کیلئے خود کام کرنا ہوگا۔ یہ صنفِ نازک کی رعنائی کو ہمیشہ کیلئے مسل کر رکھ دے گا۔"[1]

میری دانست میں عورتوں کا معاشی جد وجہد میں حصہ لینا اتنا معیوب نہیں جتنا کہ گھر کی مرکزیت، امومت کے فرائض اور دین کے احکام سے غافل ہو جانا ہے اگر عورتیں معاشی جد وجہد میں حصہ لیں تب بھی انہیں فکر کا مرکز اور محور گھر ہونا چاہئے۔ عورتوں کا معاشی جد وجہد میں حصہ لینا ہرگز بے راہ روی کو جنم نہیں دے سکتا .....

---

[1] سفرنامہ اقبال۔ انور حق نواز صفحہ ۱۱۷

لہٰذا قابل اعتراض شے لادین تہذیب اور بڑھتی ہوئی عریانیت ہے۔ یہاں انگریزی کے حصول پر تنقید محض شاعرانہ اسلوب بیان ہے۔ خود اقبال نے تحریر کیا ہے۔

"تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوب بیان ہے۔ اسلوب بیان کو شاعر کا حقیقی (view) نظریہ قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ ایسے اسالیب بیان کی مثالیں دنیا کے ہر لٹریچر میں موجود ہیں۔" [۲]

نہ ہی اقبال تعلیم نسواں کے خلاف ہیں اور نہ انگریزی تعلیم کے بلکہ اقبال کی نگاہوں میں عورت کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و شائستگی پر آئندہ قوموں کی بقا اور ترقی کا دارومدار ہے۔ اقبال کے یہ خیالات پڑھئے۔

"عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے۔ "ماں" اور "بیوی" دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مشترک ہیں۔ پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فرد واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اگر اس قوم کا آدھا حصہ مطلق جاہل رہ جائے۔ لیکن اس ضمن میں ایک غور طلب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ان کے وہ شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں قائم رہیں۔ میں نے اس سوال پر غور کیا ہے۔ مگر چونکہ ابتک ملک کسی قابل عمل نتیجہ پر نہیں پہنچا ہے۔ اس واسطے فی الحال اس بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔" [۳]

عورتوں کی تعلیم کس نوعیت کی ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق اقبال نے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا ہے تاہم عورتوں کی تعلیم کو بہت ضروری گردانا ہے۔ اور اپنی نظم "عورت اور تعلیم"

---

[۲] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ عطاء اللہ ص ۳۱۴ بنام آل احمد سرور مورخہ ۱۲ مارچ ۳۷ء

[۳] قومی زندگی از اقبال۔ منقول اقبال کے نثری افکار۔ مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۸۹

مشرقی اقوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر اکبرؔ نے طنز کے تیر برسائے تو اقبال نے بھی مغربی تہذیب و تمدن کی عریانیت اور لادینی پر اکبرؔ کے رنگ میں حملے کئے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی!
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّنظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

یہاں اقبال نے تعلیم نسواں کے خلاف آواز بلند نہیں کی ہے بلکہ ہندوستانی عوام کی اس روش پر طنز کیا ہے جو مغرب کی عریانیت کو ترقی کا معیار سمجھ کر اختیار کی جا رہی تھی۔ اقبال نے مغرب کی جس روش کو ہدفِ تنقید بنایا ہے وہ نہ مغرب کی علمیت ہے اور نہ انگریزی تعلیم۔ بلکہ انگریزی تعلیم سے مراد وہ لادینی اور عریانیت ہے جو انگریزی زبان کی وساطت سے مشرقی تہذیب کا جزو بنتی جا رہی تھی۔ نابغہ روزگار ہستیاں ہمیشہ زمانے کے ساتھ چلتی ہیں۔ اگر واقعی انگریزی تعلیم معیوب ہوتی تو اقبال نہ خود انگریزی زبان میں اپنے خطبات پیش کرتے۔ اور نہ اپنے بچوں کو علم و ادب سے بہرہ ور کرتے۔ دراصل یہاں طنز روشِ مغرب پر ہے۔ جو تباہی و بربادی اور ہلاکت آفرینی کا باعث ہے۔ کیونکہ تعلیم خواہ کسی زبان کی ہو بُری نہیں۔ بلکہ اقبال تو مغرب کی علمیت کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ اسے مشرق کے واسطے بہترین رہنما قرار دیتے ہیں۔

"۔۔۔۔ مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں۔ اور اسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کیلئے ان کے ادبیات و تخیلات اہلِ مشرق کے واسطے بہترین راہ نما ہیں۔" [1]

---

[1] دیباچہ مثنوی اسرار خودی از اقبال
منقول اقبال کے نثری افکار۔ مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۸۹

اقبال اور عورت

فہمیدہ بیگم
ریسرچ اسکالر، کلکتہ یونیورسٹی

سماجی مسائل کے تحت اقبال کے ان خیالات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو انہوں نے عورتوں کے حقوق اور درجے کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ اور عورت کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی میں سوز و دروں!
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنون
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن!
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

لیکن جب وہی عورت جس کے دم سے اقبال کے الفاظ میں تصویرِ کائنات میں رنگ ہے۔ مغرب کی لادین تہذیب اور تمدن سے متاثر ہو کر اسی رنگ کو اپنانے کی جدوجہد کرنے لگی، تو اقبال نے اس رنگ کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا اور مغربی تہذیب و تمدن کے معیوب پہلو پر تنقید بھی کی۔ مغربی تہذیب کی عریانیت اور لادینی کو مشرقی اقوام نے مغربی تہذیب و تمدن کی ترقی کا معیار سمجھا اور ان کے قبیح و مذموم افعال سے

داؤد کے چند اشعار ؎

۱۔ فاقے کئے حضور نے اور پیٹ بھر دیا
مسکین کا یتیم کا بیکس اسیر کا

۲۔ داؤد کی دعا ہے دمِ آخری ہو جب
نکلے زباں سے نام نبیؐ کے وزیر کا

۳۔ نہ دیکھا بے خزاں گلشن کسی کا
سدا رہتا نہیں جوبھی کسی کا

۴۔ کہا مجھ سے رقیبوں کا بلانا ہم نہ چھوڑیں گے
تمہیں ہے اختیار آؤ نہ آؤ میری محفل میں!

۵۔ الٹی سمجھاتے ہیں جو سنتے ہیں مجھ سے حالت
دردِ دل ابتو ہے داؤد سنانا مشکل!

۶۔ فصلِ گل آئی خدا کے لئے چھوڑ اے صیاد
کچھ دنوں شوریہ نغموں کا مچالے بلبل!

(سید حسن امام)
۲۸ مارچ ۸۵ء

پیدا ہوئے تھے۔ داؤد کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسنؑ کے لڑکے حسن مثنیٰ سے ملتا ہے۔

حسن مثنیٰ جن کی شادی حضرت امام حسین ابن علیؑ کی لڑکی فاطمہ صغرا سے ہوئی تھی۔ جو شہر بانو کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ (فاطمہ صغرا سفر کربلا معلےٰ میں مدینہ میں رہ گئی تھیں۔ داؤد کا نام سید محمد فیاض علی خاں اور عرف مہدی تھا۔ داؤد تخلص فرماتے تھے۔ ان کے والد کا نام نواب اعظم علی خاں بہادر اور والدہ کا نام عزیز محل تھا۔ داؤد کی ابتدائی تعلیم مرشد آباد میں ہوئی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع میں اپنے والد اعظم علی خاں سے اصلاح لینے لگے لیکن والد کے انتقال کے بعد میر افسوق جو ان کے دربار سے وابستہ تھے اصلاح لینے لگے لیکن مذہب کی طرف زیادہ جھکاؤ ہونے کی وجہ سے اس فن میں زیادہ توجہ نہیں دے سکے ان کا دیوان "لحن اردو" جو ۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے شائع نہ ہو سکا۔ لیکن قلمی نسخہ اب بھی محفوظ ہے۔ داؤد کو شعر و شاعری کے علاوہ جانور پالنے شکار کھیلنے اور باغ لگانے کا بھی شوق تھا۔

داؤد کی مادری زبان اردو تھی لیکن فارسی عربی زبان میں بھی غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ سید عابد علی لکھتے ہیں۔

داؤد صرف عالم فاضل اور شاعر ہی نہیں تھے ایک رحمدل اور غریب پرور انسان بھی تھے۔ آج بھی مرشد آباد میں لوگ ان کو یاد کرتے ہیں۔ مرشد آباد کے آخری دور میں یہ چراغ ۱۹۴۰ء میں ہمیشہ کیلئے گل ہو گیا۔ ان کی قبر ان کے گھر کے امام باڑے (جعفر گنج کا امام باڑہ) میں ہے۔ اردو کے اس گمنام شاعر کو اپنی زندگی میں فیاضی کی وجہ سے کافی شہرت ملی۔ لیکن افسوس اردو ادب میں ابتک کوئی مقام نہیں ملا۔ داؤد شاعری صرف تفنن طبع کے لحاظ سے کرتے تھے۔ کسی مشاعرہ میں اپنا کلام نہیں سناتے تھے جس کی وجہ سے شاعری کی دنیا میں وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ داؤد کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعر ہیں جو بالکل گمنام ہیں۔ لوگ ان کا نام تک نہیں جانتے۔ پتہ نہیں کبھی ان کو اردو ادب میں جگہ ملے گی بھی یا نہیں۔

گرچہ مرشد آباد کی ترقی کا چمکتا ہوا ستارہ پلاسی کی جنگ کے بعد ہی غروب ہو چکا تھا لیکن اس کی روشنی ۱۹۴۷ء تک یعنی آزادی کے قبل تک باقی تھی لیکن آزادی کے چند سال بعد ہی یہ شہر بالکل ویران ہو گیا۔ ادبا و شعراء اس شہر کو چھوڑ کر لکھنؤ، دہلی، کلکتہ کا رُخ کیا۔ اب نہ محفل جمتی ہے نہ مشاعرہ ہوتا ہے نہ کوئی شعر و شاعری سے دلچسپی لیتا ہے۔ جہاں جھاڑ فانوس جگمگاتے تھے آج دیا بھی نصیب نہیں ہے۔ اس شہر کا عجیب و غریب عالم ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں ۷۰ مسجدیں تھیں۔ اذان کی آواز سے سارا شہر گونج اٹھتا تھا اب یہ عالم ہے کہ صرف چند مسجدیں ایسی ہیں جہاں نماز ہوتی ہے۔ باقی سب ویران ہیں بعض کے تو نشان تک باقی نہیں ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم نے اس شہر کو بالکل ویران کر دیا۔ نوابین اور شرفا سب اپنے وطن کو چھوڑ کر اپنا مستقبل سنوارنے پاکستان چلے گئے۔ کچھ تو تحصیل علم اور روزی روٹی کے تلاش میں اس شہر کو خیرباد کہا۔ اسکندر علی مرزا جو پاکستان کے صدر تھے اس شہر کے تھے اور نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اب بھی نواب خاندان کے لوگ یہاں موجود ہیں۔

علم و ادب کے مقابلہ میں مرشد آباد دہلی اور لکھنؤ سے کم نہیں تھا۔ لیکن افسوس دہلی اور لکھنؤ اُجڑنے کے بعد آباد ہو گیا۔ لیکن مرشد آباد نہ آباد ہوا نہ آباد ہونے کی کوئی امید نظر آتی ہے مسجدوں اور امام باڑوں کی حالت دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اگر یہی حال رہا تو اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ یہاں کے ادب و تہذیب آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔

مرشد آباد کے شعراء میں چند ایسے شعراء بھی تھے جو صاحب دیوان ہونے کے باوجود گمنام ہیں۔ لوگ ان کا نام تک نہیں جانتے۔ مرشد آباد کے آخری دور کے شعراء میں داؤد کا نام آتا ہے جو ایک صاحب دیوان شاعر ہونے کے باوجود گمنام ہے۔ مرشد آباد کے گمنام شاعروں کی تحقیق ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب (صدر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی) نے میر باقر علی مخلص پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جو مرشد آباد کا شاعر تھا اور نواب خاندان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جاوید نہال صاحب (صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج) اپنی کتاب "تحقیق اور تنقید" میں داؤد کا مختصر سا ذکر کیا ہے۔ لیکن داؤد کی زندگی اور شاعری ابتک پردے پڑے ہیں۔

داؤد ۱۹ اپریل بروز جمعہ ۱۸۶۳ء میں مرشد آباد میں ایک خوش حال نواب خاندان میں

مرشد آباد کا

ایک صاحب دیوان شاعر

از:— سید حسن امام

مرشد آباد بنگال بہار اور اڑیسہ کا پایۂ تخت تھا اور یہاں نوابوں کی حکومت تھی۔ نوابوں کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا جس کی وجہ سے وہ شعراء کی سرپرستی کرتے تھے۔ یہ شہرت سن کر دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد سے پریشان حال شعراء اپنا مستقبل سنوارنے مرشد آباد چلے آئے اور نوابوں کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے مرشد آباد علم و ادب کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اسمیں دو رائیں نہیں کہ اردو کے طفلِ شیر خوار کی پرورش بنگال میں سب سے پہلے مرشد آباد میں ہوئی۔ نوابوں اور امراء کی غیر معمولی کوششوں سے مرشد آباد کا شمار ہندوستان کے عظیم شہروں میں ہونے لگا۔ انشاء اللہ خاں انشاء جیسے شاعر اس سرزمین میں پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ میر باقر علی مخلص قدرت اللہ قدرت میر افسوں کی شاعری کی خوب دھوم مچی۔ لیکن افسوس یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔

انگریزوں نے مرشد آباد کی جگہ کلکتہ کو بنگال کی راجدھانی بنایا۔ آہستہ آہستہ یہاں کی رونق ختم ہونے لگی۔ نوابوں کی حالت دن بہ دن خستہ ہونے لگی۔ آخر کار ادباء اور شعراء نے بھی مرشد آباد کو خیرباد کہا جس کی وجہ سے مرشد آباد کے علم و ادب کا گلستاں دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے اجڑ گیا۔

منٹو جس دور میں افسانہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت ترقی پسندی کا دور عروج پر تھا اس دور میں کسان، مزدور طبقہ اور سرخ سویرے کے ارد گرد گھومتی تھیں۔ منٹو نے بھی اس راستہ کو اختیار کیا اور پھر بعد میں اپنا ایک الگ راستہ اختیار کیا۔ لیکن ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ترقی پسند راستہ کو ترک کر دیں۔ اور اس پر وہ گامزن رہے۔

منٹو نے اپنی کہانی کو جس زبان میں استعمال کیا ہے وہ زندگی سے بہت ہی قریب ہے۔ معمولی بات کو اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ بقول منٹو۔

"وہ دن گذر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں۔ نیا قانون"

منٹو کو کردار نگاری پر کافی مہارت حاصل ہے اور واقعات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی کردار نگاری میں ان کی شخصیت کا جوہر دکھائی دیتا ہے۔

کہانی جب climax کی جانب آتی ہے تو قاری کو بھی "نیا قانون" کے بارے میں انتظار رہتا ہے۔ استاد منگو نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے اور اس کے بعد حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ بقول منٹو

"نیا قانون۔ نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی پرانا ہے"

۱۹۴۷ء سے پہلے ہمارا ملک انگریزی سامراج کے ہاتھوں میں غلام تھا۔ قوم اپنے آپ کو آزاد تصور نہیں کرتی تھی۔ جب ملک ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا۔ تو ہندوستانی قوم میں بیداری آئی۔ اور اسے نیا ہندوستان کہنے لگیں۔ مگر ان کا خواب پورا نہیں ہوا۔ یہ افسانہ ہندوستان کی آزادی کا واقعہ ہے لیکن ہندوستانی عوام کا خواب چکنا چور ہو گیا استاد منگو سارے ہندوستانی عوام کا ایک نمائندہ ہے۔ اور اسی جگہ منٹو ایک فنکار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اب اس مضمون کو سردار جعفری کے الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

"منٹو کی افسانہ نگاری ہندوستان کے درمیانی طبقے کیلئے مجرم ضمیر کی فریاد ہے اسلئے منٹو اردو ادب کا سب سے زیادہ بدنام افسانہ نگار ہے اور وہ بدنامی جو منٹو کو نصیب ہوئی، مقبولیت اور شہرت کیطرح کوشش سے حاصل نہیں کیجا سکتی۔ اسلئے کہ فن کار میں اصلی جوہر ہونا چاہئے اور منٹو کا جوہر اسکے قلم کے نوک پر آبگینے کی طرح چمکتا ہے۔

••

ہیرو استاد منگو ہے جس کو انگریزوں سے سخت نفرت ہے۔ ایک ٹانگے والا ہے۔ اور پہلی اپریل کو "نیا قانون" نافذ ہونے کی خوشی میں اپنے ٹانگا اور گھوڑے کو سجاتا ہے لیکن اس کی خوشی اس وقت ختم ہو جاتی ہے۔ جب پہلی اپریل کو نیا قانون نافذ نہیں ہوتا اور انگریز سے مار پیٹ کرنے کے نتیجے میں اس کو حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

۱۹۱۷ء میں روس میں لینن کے ذریعۂ مزدوروں کا انقلاب آیا۔ اس انقلاب کا خیر مقدم جہاں شعرائے کیا وہاں افسانہ نگاروں نے بھی کیا۔ ان میں ایک منٹو بھی ہے۔ بقول منٹو۔

"دورانِ گفت گو میں اس نے کئی مرتبہ ننھو گنجے کا ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا تو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بلوشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

کہانی کی ابتدا فساد کے واقعات سے شروع ہوتی ہے۔ استاد منگو کو فساد سے سخت نفرت ہے اور کہتا ہے۔" اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔

منٹو نے اکبر بادشاہ کا نام اس لئے لیا ہے کہ اکبر ایک سیکولر بادشاہ تھا۔ اور اس نے اپنی حکومت میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو جگہ دی تھی۔ یہی منٹو کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ لیکن استاد منگو کو "نیا قانون" کی فکر لگی رہتی ہے اور اس کے لئے وہ دن رات انتظار کرتا رہتا ہے۔

منٹو کی عظمت اور انفرادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فن اپنے معاصرین اور متاخرین کے لئے بیحد متنازعہ فیہ رہا ہے۔ بعض نقادوں نے ان کو عریاں نگار اور فحش نگار قرار دیکر رد کر دیا ہے۔ لیکن بعض نقادوں نے ان کے ہاں فنکاری کا اصلی جوہر تلاش کیا ہے۔

"نیا قانون" میں منٹو نے ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں سماجی، ذہنی اور فکری زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ان کا فن صحافت پروپگنڈہ کا نہیں ہے۔

منٹو کا فن

نیا قانون کی روشنی میں

ایم۔ علاؤالدین
ایم۔اے سال دوم

اردو افسانہ کی عمر بہت ہی مختصر ہے لیکن اس مختصر عرصے میں اس نے غیر معمولی ترقی کی۔ اردو ادب میں منشی پریم چند نے مختصر افسانے کا آغاز کیا اور دوسرے لوگوں نے اس کو پروان چڑھایا۔ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ اور انگارے کے افسانے نمودار ہوئے۔ اردو افسانوں میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں اردو افسانوں میں کئی نئے چہرے سامنے آئے۔ ان میں خاص طور پر کرشن چندر۔ بیدی اور منٹو قابل ذکر ہیں۔

منٹو کو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ منٹو نے جنسیات کا سہارا لیکر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان کے تمام افسانے جنسیات سے متعلق ہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا قول ہے کہ "جنس سے محبت کرنے کیلئے جنس کا احترام کرنا لازمی ہے۔ جنس کی اہمیت ادب میں اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ اس کا تعلق براہ راست انسان کی زندگی سے ہے۔

منٹو کا افسانہ "نیا قانون" ایک جذباتی افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا اصل

نہیں دی گئی ۔ کیونکہ ناخواندہ اور گنواروں کی بولی سمجھی جاتی ہے ۔

چند برسوں پہلے ابراہیم ہوش نے کلکتیا اردو میں شاعری شروع کی ۔ اس زبان میں ان کا مختصر کلام " جندگی کا میلا " شائع بھی ہوا مگر شرفاء اسے ہضم نہ کر سکے ۔ اور کلکتیا اردو بول چال تک محدود ہے اور رہے گی !

دو نظمیں

شمیم انور

(۱)

خنجروں کی نوکوں پہ
لکھے ہوئے ـــــ ہمارے نام ہی ملیں تو
ساحلوں پہ
اک سفید فاختہ کے انتظار میں
پیڑ ہم لگائیں کیوں
کاغذی محل کے آس پاس
آگ نہ جلائیں کیوں ؟

(۲)

مُردہ جسموں کے سوراخوں کی گہرائی
ناپی جا رہی ہے
گدھوں کی چونچ کی لمبائی
ناپی جا رہی ہے
نئے جاسوسی کتوں کی نئی منطق
سراغِ دستِ قاتل
اور بھی اُلجھا رہی ہے ۔

بنگال میں اردو نے مقامی بولی پر اپنا گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور مقامی بولی کا بھی گہرا اثر قبول کیا تھا۔ اور بنگلہ اور اردو ساتھ ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرنے لگیں۔ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ اردو سرکاری زبان بن گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اردو کا آفتاب افق بنگال پر چمکنے لگا۔ اور اس کی روشنی اندرونی علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ اور بنگالی مسلمانوں اور ہندوؤں نے ہندوستان کی اس جدید زبان کو آنکھوں سے لگایا۔ اس میں شاعری شروع کی۔ کہانیاں اور حکایتیں لکھیں، راجہ جنم جے مترا راجہ رام موہن رائے۔ منشی سدا سکھ لعل۔ ہرہر دت کشیب چندر کرموکار۔ تارا دن چرن مترا، راجہ کنور اور بہت سے بنگالی شعراء و ادباء کی خدمات کبھی فراموش نہیں کیجا سکتی۔

اردو اور بنگلہ نے ایک دوسرے کا کس حد تک اثر قبول کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج بھی بنگلہ زبان میں اردو فارسی کے بہت سارے الفاظ مستعمل ہیں اس کا خبر ولانیفک ہیں جن میں مقابلہ، تاریخ، بالش، پوشاک، مہری، آئینہ، عدالت، قلم، کاغذ، راستہ، پاؤ، بانی، محل نویس، پاگل، مجموعہ دار، (مزمدار) وغیرہ شامل ہیں۔ اردو میں بھی بنگلہ الفاظ در آئے ہیں۔ مگر ادب میں ان کو جگہ نہیں مل سکی۔ بول چال تک مقامی لوگوں میں آج بھی رائج ہے۔ ان میں ٹھو "کن (خریدنا) ٹھیانی، توڑہ ماکڑی، چھاگل وغیرہ کلکتہ کے قدیم باشندے اسے اردو سمجھ کر بول لیتے ہیں اور اردو بنگلہ کے اختلاط و اثرات سے شہر میں ایک نئی بولی بھی جنم لیتی ہے جو کلکتیا اردو کے نام سے مشہور رہے۔ کلکتہ کے قدیم باشندوں میں مروج ہے "تم کیا کرو ہو، ہم جابے ہیں۔ ہم پڑھے ہیں۔ تم کاج کرسیو ہونا۔ ایک ٹھو روپیہ ہے۔

دراصل کلکتیا اردو میں بہت سارے ایسے الفاظ مستعمل ہیں جو آبرو، حاتم اور میر کے زمانے میں سکہ رائج الوقت تھے۔ تنک، بجائے، تلک آج بھی اہل کلکتہ استعمال کرتے ہیں۔

"کلکتیا اردو" پر تہذیب کا رنگ و روغن چڑھ نہ سکا اور عقل و دانش کی خراد پر یہ چڑھ کر زبان نہ بن سکی۔ لہذا دانشوروں، عالموں اور سخنوروں نے اسے قبول نہیں کیا اسے رد کر دیا جس کی وجہ سے آج تک یہ بولی رہی ہے۔ اس میں ادب کی تخلیق پر توجہ

ہوگلی اور مرشد آباد اردو کے اہم مراکز قرار دیئے گئے ہیں۔ اردو اپنی ابتدائی شکل میں مرشد آباد، ہوگلی، مدناپور اور جہانگیر نگر ڈھاکا میں مروج ہو چکی تھی۔ اس خیال کی تصدیق اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ

"ہندوستان کی دوسری جدید زبانوں کی طرح اردو کی ترقی کی رفتار بھی سست تھی۔ بہت دنوں تک یہ بول چال کی زبان رہی۔ اظہار مطالب کیلئے استعمال ہوتی رہی مگر سولہویں صدی عیسوی میں جب یوروپین سیاحوں اور سوداگروں کے قدم بنگال میں جمنے لگے تو انہیں اس زبان کے سیکھنے اور پھیلانے کا خیال ہوا۔"

(انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص۳)

یوروپین سیاحوں اور سوداگروں کی مساعی کی وجہ سے ہندوستانی زبان کو بنگال میں بھی مقبولیت ہوئی۔ گو یہاں اس کا ارتقائی عمل بہت سست تھا۔ بنگال میں پندرھویں صدی میں یہ بولی ٹھولی کی حیثیت سے رائج ہو چکی تھی مگر ۱۷ویں صدی میں یہ زبان بن سکی۔ اور اسمیں ادب کی تخلیق ہوئی۔

اس عہد میں مرشد آباد بنگال کا دارالسلطنت تھا اور یہ ہی تاریخی شہر اردو کا سب سے اہم مرکز بنا۔ ۱۷ویں صدی عیسوی میں بھی صوفیائے کرام اور دانشوروں کا نشان ملتا ہے۔ جنہوں نے کھڑی بولی (اردو) میں شاعری شروع کی تھی۔ ۱۸ویں صدی اور انیسویں صدی میں یہ ان باکمال شاعروں کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔ جو دلی کی تاخت و تاراج کے نتیجے میں لکھنؤ عظیم آباد اور پھر مرشد آباد میں منتقل ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں مرشد آبادی ادیبوں اور شاعروں کو اس پر فخر تھا کہ دلی اور لکھنؤ کی طرح اس شہر کے ٹکسال ادب سے محاوروں اور روزمرہ کے سکے ڈھل کر نکلتے۔ فیاض علی داؤد نے اپنے غیر مطبوعہ دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ——— "میں نے اپنے اشعار میں جو زبان اور محاورے استعمال کئے ہیں وہ مرشد آباد سے الگ ہوں تو گردن زدنی ہوں۔"

بنگال کے باشندوں کی زبان بنگلہ تھی۔ اس میں بھی انیسویں صدی کے آغاز میں باضابطہ ادب کی تخلیق کا عمل شروع ہوا تھا۔ اس کے لئے پہلے یہ بولی تھی۔ اس میں محض بولچال لٹریچر کا پتہ چلتا ہے۔

جو پراکرتیں کہلاتی تھیں۔ ان ہی پراکرتوں سے شورسینی، اب بھرنش، شورسینی اب بھرنش وغیرہ جنم لیتی ہیں۔ ۱۲ ویں صدی عیسوی میں جب مسلمان ہندوستان آئے اور ہندوستان میں غلام خاندان کی حکومت قائم ہوئی تھی تو اس سے پہلے ہریانہ، پنجاب، آگرہ، متھرا، ہردوار اور دلی میں برج بھاشا بولی کی سرحد سے نکل کر زبان بن چکی تھی۔ اور اس میں ادب کی تخلیق ہونے لگی تھی۔ کھڑی بولی جب فارسی عربی اور دوسری ہندوی بولیوں کے امتزاج سے مہذب زبان بن گئی تو اس میں ادب کی تخلیق ہونے لگی

"کھڑی بولی" پہلے مسلم فاتحین، صوفیائے کرام اور مشائخ کے گروہ کے ساتھ حیدرآباد پہنچتی ہے۔ اور شمالی ہند کی اس بولی، فارسی عربی اور پہلگو کے اختلاط سے اردو دکھنی کی تخلیق ہوئی اور اس وقت جب شمالی ہند میں کھڑی بولی (اردو) محض بول چال تک محدود تھی۔ اردو دکھنی میں شاہکار ادب کی تخلیق ہونے لگی تھی۔ بالکل اسی طرح مسلمان بادشاہوں کے ساتھ شمالی ہند کی کھڑی بولی، (جو بعد میں اردو کا نام پائی) بنگال پہنچی اور یہاں کی بنگلہ بولی کے دوش بدوش سکہ رائج الوقت بن گئی جس کی تصدیق ۱۵ ویں صدی اور سولہویں صدی کے صوفیائے کرام صوفی شاہ عبدالحق نورالحق پانڈوی اور حاجی پیر رب رام سقہ کے فارسی ہندی گیت؛ اور اشعار سے ہو جاتی ہے۔

"مشرقی ہند کا سفر" میں یورپی سیاح ٹیری نے اس کی تصدیق کی ہے کہ

"یہاں کی بولی بنگلہ ہے مگر عوام ہندوستانی بولی بولتے ہیں جو کباڑیوں کی زبان ہے ۔۔۔ (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۵ ویں صدی کی آخری دہائی میں کھڑی بولی بنگال میں بھی رائج ہو چکی تھی۔ اور مختلف علاقوں میں پھیل چکی تھی۔

بنگال میں اردو زبان کے ارتقاء پر بحث کے دوران اس بنیادی خیال کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ راجہ لکشمن سین کے فرار اور بنگال میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد ترکی، ایرانی اور افغانی فوجی بھی یہاں بس گئے اور ان کے قبل مالدہ کے گوڑ، لکھنوتی پنڈوا اور ہوگلی کے پنڈوا، بردوان اور مدناپور کے منگل کوٹ اور مدنی پور میں صوفی خانوادے آباد ہو چکے تھے اور تبلیغ و اشاعت مذہب کیلئے کباڑیوں کی بولی یعنی کھڑی بولی کو ہی ذریعہ گفتگو بنانے پر مجبور ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے اردو کی جڑیں بنگال کی زمین میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔

بنگال میں
اردو کا لسانی ارتقاء

ڈاکٹر جاوید نہال
استاذ شعبۂ اردو۔ کلکتہ یونیورسٹی

انسان کے ارتقاء کی تاریخ کائنات میں ارتقاء سے وابستہ ہے۔ زبان کا ارتقا بھی کبھی تہذیب، کی تاریخ کا زریں باب تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں زبان کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ :-

"انسان اور حیوان میں یہ ہی فرق ہے کہ انسان کے پاس بولتی ہوئی زبان ہے۔ اور حیوان کی زبان گنگ ہے۔ یہی بولتی زبان انسانی شعور کی علامت ہے۔ اس کے دکھ، درد، خوشی، غمی، خیال، احساس، جذبہ اور فکر و تجربہ کا اظہار ہے"

لسانی ارتقاء کی بحث جب شروع ہوئی۔ اس کی ابتدا اس سے ہوئی کہ اظہار و خیال کے لئے ہر قوم اور ہر قبیلہ کے لوگوں نے اپنے لئے کوئی بولی تلاش کرلی۔ جو مختلف حالات سے دوچار ہوتی ہوئی اور دوسرے فرقہ قبیلے اور قوموں کی بولیوں سے خلط ملط ہونے کے بعد زبان کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس قاعدہ کا اطلاق ہماری اردو زبان پر ہوتا ہے۔ جو مسلم فاتحین کی آمد کے بعد صوفیائے کرام مشائخ کی مساعی اور مختلف صوبوں کے عوام کے میل جول کے نتیجے میں عالم وجود میں آئی۔

آریہ قوم کی ادبی زبان سنسکرت کے ساتھ ہندوستان میں مختلف بولیاں رائج تھیں۔

اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ الفاظ اور اس کے برمحل استعمال کی اہمیت سے شاعر واقف ہے۔ استعارات و تشبیہات اور الفاظ و محاورات کہیں پر مقصود بالذات نہیں ہیں ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے ایک فن کار کے حق میں اس کے آلات۔ قدیم بزرگواروں اور ان کے خوشہ چینیوں کی ان کا خیال لفظ کے تابع نہیں بلکہ حکمراں ہے۔

چونکہ شاعر کے فن کا تفصیلی جائزہ سردست مقصود نہیں ہے اسلئے چند اشعار جو مجھے پسند آئے ہیں ان کو بطور خاتمۂ مضمون کے پیش کرتا ہوں۔

ترے بیمار پہ طاری ہے عشق کا عالم!
کہیں گل ہو کے نہ رہ جائے چراغِ سحری

دل فدائے روئے جانانہ ہوا تو کیا ہوا
شمع پر قربان پروانہ ہوا تو کیا ہوا

مسکرا کر میری جانب اک نظر تو دیکھ لے — ختم ساقی دورِ پیمانہ ہوا تو کیا ہوا

تو نہ ہو بد دل کہ تیری بزم تو آباد ہے — تنگ صحرا میرا کاشانہ ہوا تو کیا ہوا

اے تیغ ناز معشوقۂ دلدار مرحبا! — جو میرا مدعا تھا تیرا مدعا ہوا!

کس طرح تو سناتا ہے حالِ دل ان کو — بنا رہا ہوں حقیقت کو اپنی افسانہ

لرز لرز کے سرِ بزم خود بھی ہو گئی گل — کیا جو شمع نے محفل میں خون پروانہ

اک غم کی صدا دل سے نکلتی ہی رہے گی — یہ سانس محبت کی ہے چلتی ہی رہے گی

کیا مجھ سے بیاں ہو تری گفتار کی لذت — اک بات سے اک بات نکلتی ہی رہے گی

"شامِ روح" کے صفحات میں جو سرمایہ شعر و ادب پیش ہوا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ شاعر موضوعات شاعری کے اعتبار سے کسی نئی دنیا کی طرف قدم نہیں بڑھاتا ہے اس کی تخیل اسی محور کے گرد چکر لگاتی ہے اور ادب کے اسی صحن چمن میں گلگشت کرتی ہے جس کی جانی پہچانی اور دیکھی بھالی فضا میں پہنچ کر ہم کو اپنی روایتی شاعری کی سرحدیں دکھائی دیتی ہیں۔ حسن و عشق اپنی جملہ روایات، فراق و وصال، حسرت و ارمان، کرب و بیچینی، جفا و وفا، ناصح و چارہ گر کے لوازم کے ساتھ جزو داستان بنے ہیں۔ حیات و موت، بے ثباتی عالم، شکوۂ روزگار، فلک ناہنجار، فقر و غنا جیسے موضوعات بھی اردو شاعری کے اسی قدیم طرز فکر کے آئینہ دار ہیں۔ جو سے اہل بصیرت کے نزدیک شاعر کی افتاد طبع اور ان کی شاعری کی سمتیں یک گونہ متعین ہو جاتی ہیں۔ ان کے افکار حسن و عشق کے باب میں کسی ایسے محبوب کو جنم نہیں دیتے جو ان کا اپنا محبوب معلوم ہو اور جس کے خد و خال ایسے نمایاں ہوں کہ اس کو مجمع خوباں میں بآسانی الگ کر لیا جائے۔ اسی کے بالمقابل وادیٔ عشق میں بھی جیب و گریباں، آستین و داماں کے ساماں پیرہن کے اندر ایک ایسی ہستی مہجور کو ہم خاک بسر پاتے ہیں جس سے ہماری شاعری کا صحرائے بجد بھرا پڑا نہیں تو خالی بھی نہیں ہے۔

مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر نے نری تقلید سے کام لیا ہے اور کہیں پر ایسا ڈھنگ نہیں جس میں انفرادیت کی جھلک نہ ہو۔ بلکہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ کو تو شاعر کے فن کا کمال اسی میں نظر آتا ہے کہ اظہار فن اور عرض ہنر کے لئے شاعر نے اپنی دنیا سے روگردانی نہیں کی ہے اور اس وابستگی کے باوصف کچھ ایسی باتیں کچھ ایسے لب و لہجہ میں کہہ دی ہیں جن کی وجہ سے ان کا فردوس تخیل ہم سب کے لئے تماشہ گاہ بنا ہوا ہے۔

"شامِ روح" کی غزلوں کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ شاعر تعمق فکر کی وجہ سے کبھی کبھی سنجیدہ گفتاری کا سماں پیدا کر دیتا ہے مگر اس کے باوجود تغزل کہیں مجروح نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ افکار اور جذبات کی تقسیم کے باب میں شاعر کی طبیعت بہت متوازن معلوم ہوتی ہے۔ وہ رفعت فکر کو عزیز رکھتے ہیں مگر جذبات کی لہک اور اثر خیزی سے بے خبر نہیں۔ ذخیرۂ الفاظ پر نظر ڈالئے تو شاعر کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ اور

تاباںؔ کلکتوی مرحوم

سیّد شاہ مقبول احمد
استاذ شعبۂ اردو۔ کلکتہ یونیورسٹی

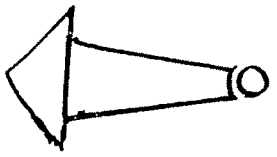

ایک منحنی و لاغر جسم، قد میانہ، آنکھیں نشیلی، رخسار کسی قدر اندر کو دھنسے ہوئے پیشانی کی لوح پر انشراح سے زیادہ انقباض کے آثار نمایاں، فطرت نے یہ اشیاء عناصرِ ترکیبی کے نام سے مرحوم کو ودیعت کر رکھی تھیں۔ ان اجزاء سے جس ہیولیٰ کی تشکیل ہوتی تھی۔ اسکی تکمیل کا سرانجام مرحوم ایک شیروانی اور کثرت سے پان خوری سے کرتے تھے۔ کچھ دن پہلے تاباںؔ مرحوم کی شخصیت کے نقش و نگار یقیناً یہ ہونگے۔ مگر جب میں ان کے نام سے واقف ہوا تو خدوخال یہی تھے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص مرحوم سے بطور خود کبھی نہ ملا ہو اور ان کی ذاتی خوبیوں سے ناواقف ہو اس کے لئے یہ مرقع ایسا جاذبِ توجہ نہ تھا۔ علاوہ بریں مرحوم کے بے تکلف دوستوں اور ہم نشینوں میں اسلامیہ کالج کے ایسے طلبا بھی تھے جن کی شاگردی سے مجھ ہیچ مدان کو ان کے استاد ہونے کا شرف بخشا تھا اور کارکناں قضا و قدر کے اس انتظام کے نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ اس پیشہ کی روایتی "سنجیدہ مآبی" نے بھی مرحوم سے تقرب کی راہ میں ایک حد تک امر مانع کا درجہ اختیار کر لیا تھا۔

بہرحال اپنی جگہ پہ صحیح یا غلط اسباب کچھ ایسے تھے کہ مرحوم سے علیک سلیک سے زیادہ کی نوبت نہ آئی۔ جس کا اب واقعی افسوس ہے اور رنج و تاسف اس وقت دوچند ہو گیا جب مرحوم کے مجموعۂ کلام یعنی "مشامِ روح" کے صفحات مطالعہ میں آئے۔

نہیں ہے۔

"گمنام ہمسفر" ان کا تیسرا ناول ہے جس میں ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو اپنی بدصورتی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ لیکن اسکی بدصورتی اس کا وصف بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ خوب سیرت ہے اور خوب سیرتی وہ حسن ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہتی ہے

ان کے افسانے طویل اور بیانیہ ہوتے ہیں۔ جن میں مشاہدے کی گہرائی اور جذبے کی آنچ ہے۔ ہر افسانہ دلچسپ اور اپنے اندر ایک تاثر رکھتا ہے۔ انہوں نے جس زمانے میں افسانے لکھے۔ اس زمانے کے افسانوں میں نفسیاتی گتھیاں کم ہوتی تھیں یہی وجہ ہے صغریٰ سبزواری کے افسانوں میں نفسیاتی الجھنیں نہیں ہیں۔

ان کے ترجمے سلیس، شگفتہ اور رواں ہوتے ہیں۔ آپ ترجمے کے فن سے کما حقہ واقف ہیں۔ آپ نے مقالے بھی لکھے ہیں جو اہل نظر سے داد پا چکے ہیں۔ صغریٰ سبزواری کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ آپ کے فن پاروں کی زبان سلیس سادہ اور دلنشیں ہے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو انہیں اردو ادب کی تاریخ میں نہیں تو بنگال کے اردو ادب کی تاریخ میں ضرور زندہ رکھینگی!

بقیہ :- صفحہ ۲۵ کا ایک چہرہ آدمی

ان کو الٹے پاؤں میرے گھر بھیج دیا۔ کوئی اور بیٹا ہوتا تو کہہ دیتا کہ کل صبح جاکر دیکھوں گا۔ مگر ڈاکٹر تحسین کہ انہوں نے ٹیکسی لی اور پونے گیارہ بجے رات کو ہی میرے ہاں چلے آئے۔ اس طرح تحسین ہمارے فیملی ڈاکٹر بھی بن گئے۔ اور مقبول نانا کو اکثر و بیشتر ڈاکٹر تحسین ہی کے ذریعہ ہمارے گھر کی خیریت ملا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ جب تک تحسین نے واپس جاکر اپنے ابا کو ہمارے گھر کی خیریت اور تفصیلی حال چال نہیں بتایا، وہ سو نہیں سکے۔ یہ چاہت اور دردمندی۔ سوچتا ہوں کہ اس کا کوئی صلہ اور رمول بھی کیا ممکن ہے۔

مختصر یہ کہ پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب ہوں یا مقبول نانا۔ ان کے کردار میں جو وضع داری، دردمندی، اور بے لوث چاہت کا احساس ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیبی وراثتوں سے محرومی کے دور میں مقبول نانا کو اس عظیم ورثہ کی نگہداشت کیلئے کتنی اذیتوں، اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہوگا۔ میرا یقین ہے کہ ان مرحلوں سے گذر کر ہی نانا کو "ایک چہرہ آدمی" کی عظمت نصیب ہوئی ہے۔

"خواب و بیداری" ایک اچھا ناول ہے۔ اچھے ناول کی پہچان یہ ہے کہ اسمیں دلچسپی ہو زبان صاف اور سادہ ہو۔ قاری اسمیں کھو جائے اور کتاب ختم کرکے چین لے۔ یہ باتیں اس ناول میں ہیں لیکن مصنفہ نے اس ناول کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے۔ اولین بابوں میں جو واقعات بیان کئے۔ آخر کے بابوں میں ان ہی کو دہرایا گیا ہے جس سے ناول کا تاثیر اور پلاٹ مجروح ہوتا ہے لیکن یہ ناول جس زمانے میں لکھا گیا ہے اس زمانے میں ناول کا آرٹ یہی تھا

"موت کا سایہ" صغریٰ سبزواری کا دوسرا ناول ہے جس کو راقم الحروف نے ۱۹۷۱ء میں کلکتے سے شائع کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسمیں راقم کا نام نہیں ہے اور اس زمانے میں اسکی ضرورت بھی نہیں تھی۔ "موت کا سایہ" ایک جاسوسی ناول ہے۔ ایک جاسوسی ناول کا کمال یہ ہے کہ اسمیں زیادہ سے زیادہ تجسس، پیچیدگیاں اور الجھاؤ ہو۔ ان تجسس، پیچیدگیوں اور الجھاؤ کو کرنے کیلئے مصنف قاری کے ذہن کو مزید تانے بانے میں الجھائے اور پھر یہ گرہیں کھولتا جائے۔ فن کے اعتبار سے وہ ناول اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ "موت کا سایہ" میں بھول بھلیاں بہت کم ہیں۔ یہ ایک سیدھا سادا جاسوسی ناول ہے اور ذہین قاری ابتدائی صفحات پڑھ کر انجام جان جاتا ہے۔

"موت کا سایہ" کی کہانی یہ ہے کہ اس کا ہیرو اپنے چچا کی دولت حاصل کرنے کیلئے اپنے چچیرے بھائی کو قتل کر دیتا ہے، چچا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ سزا سے بچنے کیلئے وہ منصوبے بناتا ہے۔ سراغرساں افسر کو وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ قاتل اسکی موت کے درپے ہے۔ اور قاتل کئی بار اس پر قاتلانہ حملہ کر چکا ہے۔ کبھی اس پر فائرنگ کی۔ کبھی ٹیکسی سے کچلنے کی کوشش کی اور کبھی زہریلا سانپ بستر پر پھینک کر مارنا چاہا لیکن قاتلوں کے کھوجی مجرموں سے زیادہ مستعد، چالاک اور ذہین ہوتے ہیں۔ موت کا سایہ کا ہیرو آخر میں اپنے انجام کو پہونچ جاتا ہے۔

ایک اچھے جاسوسی ناول میں جو اثر اور گہرائی ہونی چاہئے۔ "موت کا سایہ" اس سے خالی ہے۔ یہ ستر صفحات کا ایک مختصر جاسوسی ناول ہے۔ اسکی بڑائی صرف یہ ہے کہ اس کو ایک خاتون نے لکھا ہے۔ جبکہ اردو میں جاسوسی ناول لکھنے والی کسی خاتون کا دور دور پتہ نہیں۔ زبان درست، سادہ اور پراثر ہے۔ بیان میں کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی

دیکھے ۔ دنیا کے سفر کے دوران ان کو جو تجربات پیش آئے ۔ ان کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کر دیا ہے ۔ لیکن ان کے ناول زندہ رہنے والے نہیں ہیں اور نہ ان کے افسانے قاری کے ذہن پر تادیر نقش جمائے رکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں ۔ لیکن ان کے خلوص اور ایمانداری سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

انکی غزلیں ان کے دلی واردات کی ترجمان ہیں ۔ دکھوں کی جنگل سے ان کو گذرنا پڑا ہے ۔ خار زاروں سے الجھنا پڑا ہے ۔ طویل مسافت کے سبب ان کے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں ۔ اور جب بھی یہ آبلے ٹوٹے ہیں ۔ ان کی راہیں گلنار ہوئی ہیں ۔ جن کا بیان اپنی غزلوں میں بڑے کرب اور اذیت ناکی سے کیا ہے ۔ جو دل پر اثر کرتا ہے ۔ زبان و فن کے اغلاط سے قطع نظر انکی غزلیں تاثیر رکھتی ہیں ۔ اور جو غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں وہ دل پر سیدھے وار کرتی ہیں ۔

انہوں نے کئی ناول لکھے ہیں ۔ ان کا پہلا ناول خواب بیداری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا یہ ایک سماجی ناول ہے ۔ اسمیں ایک ایسی بدنصیب لڑکی کی کہانی ہے جو جوانی کے تقاضوں سے بھٹک جاتی ہے اور اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ جاتی ہے ۔ اسلئے کہ لڑکی کا چچا لڑکے سے اسکی شادی کرنا نہیں چاہتا ۔ کیونکہ وہ سید ذات کی لڑکی ہے ۔ جبکہ اس کا محبوب پٹھان ہے ۔ لڑکی کا باپ ایک شریف انسان ہے ۔ ماں بیٹی کے درد کو جانتی ہے وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ لڑکا پڑھا لکھا، شریف اور امیر ہے ۔ پھر ان کی لڑکی سے محبت کرتا ہے ۔ لڑکی بھی اس پر جان دیتی ہے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے ۔ ذات برادری کوئی چیز نہیں ۔ اصل جوہر شرافت ہے ۔ بیوی کے دلائل کے آگے شوہر ہتھیار ڈال دیتا ہے ۔ لیکن چچا آڑے آتا ہے ۔ وہ سارے خاندان پر حاوی ہے وہ اسے اپنے خاندان کا وقار بنا لیتا ہے لیکن اسکی نیت میں خلوص نہیں فتور ہے ۔ وہ اپنی بھتیجی کی سلیقہ شعاری سے جلتا ہے اسلئے کہ خود اس کی اپنی لڑکی ناکارہ ہے ۔ لیکن وقت سب سے بڑا معلّم ہے ۔ ایک وقت آتا ہے جب لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کی شادی کسی بھی ذات کے لڑکے سے خواہ وہ عمر دراز اور نکھٹو کیوں نہ ہو کرنا چاہتا ہے لیکن محبت کی جیت ہوتی ہے اور نفرت کی شکست فاش عاشق اور معشوق میں شادی ہو جاتی ہے ۔

تھا۔ چوتھی لڑکی سکینہ رضوی گیارہ مہینے کی ہو کر فوت ہو گئی۔ پانچواں بیٹا جلال رضوی نے تاریخ میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اس وقت کراچی پاکستان میں یونائیٹڈ بنک میں کنٹرولر ہیں۔ چھٹی اولاد کا نام جمال رضوی ہے۔ اس نے بی۔ کام کا امتحان پاس کیا۔ وہ بلجیم میں پاکستانی سفارت خانے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ ساتویں اولاد نادرہ ہے۔ اس نے تیرہ سال کی عمر میں میٹرک اور پندرہ سال کی عمر میں آئی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۷ سال کی عمر میں انگریزی میں بی اے آنرز سکنڈ کلاس اور ۱۹ سال کی عمر میں انگریزی ہی میں ایم اے کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ کئی برسوں تک گوکھلے کالج کلکتہ میں انگریزی زبان و ادب کی لکچرر رہی۔ فی الحال امریکہ میں ہیں۔ آٹھویں اولاد عذرا رضوی ہے۔ اس نے بھی میٹرک اور آئی اے کے امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ اس کا ذکر آگے ہو چکا ہے۔ نویں اولاد کا نام کمال رضوی ہے۔ اس نے بی۔ اے پاس کیا ہے اور امریکہ سے ہوٹل مینجمنٹ کا کورس مکمل کیا ہے۔ فی الحال اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔

صغریٰ سبزداری کا تقرر اگست ۱۹۲۴ء میں سخاوت میموریل گرلز ہائی اسکول میں ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئیں۔ آپ نے درس و تدریس کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ آپ طالبات میں کافی مقبول تھیں اور کلکتہ کا ایک حلقہ آپ کو صغریٰ باجی کے نام سے جانتا ہے۔

صغریٰ سبزداری نے ۱۹۳۶ء سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، افسانے بھی لکھے۔ مقالے اور ناول بھی، ہندی، بنگلہ اور انگریزی کے ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے کسی ایک صنف کو مستقل نہیں اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن پارے منتشر اور مختصر ہیں۔ ان کی کاوشوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے کسی ایک صنف کو مستقل فن کی حیثیت دیا ہوتا تو ان کا نام اردو ادب کی خواتین قلم کاروں میں زندہ رہ جاتا۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا سرسری اور مختصر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہے۔ لیکن دل پر جو چوٹ لگی ہے اس کو اپنی تخلیقات میں پیش کر دیا۔

صغریٰ سبزداری نے دو بار عالمی دورہ کیا۔ ایک بار ۱۹۶۸ء میں امریکہ اور یورپ گئیں۔ دوسری بار ۱۹۷۹ء میں امریکہ گئیں۔ دو بار ملا کر تقریباً ۱۵۳ شہر

بس گئے۔ پھر آپ کے والد نے کلکتہ میں تجارت شروع کردی اور لشکری تالاب، کاشی ناتھ ملک لین کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

صغریٰ سبزواری اسی محلے میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئیں۔ ابتدا میں آپ کے گھر کی زبان فارسی تھی۔ آپ کی چار بہنیں اور پانچ بھائی تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں آپ کی شادی پروفیسر طاہر رضوی صاحب سے ہوئی۔ آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے نوکری کرنا چاہتی تھیں۔ طاہر رضوی صاحب ملازمت کے خلاف تھے۔ طاہر صاحب نے آپ سے کہا کہ کس چیز کی کمی ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے نوکری کریں گی۔ صغریٰ سبزواری دوراندیش خاتون تھیں انہوں نے طاہر صاحب کی بات نہیں مانی۔ اور یہ دلیل دی کہ موت وحیات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ پہلے میں بھی مرسکتی ہوں لیکن خدانخواستہ پہلے آپ انتقال کرگئے تو آپ کے بعد میرا اور بچوں کا کیا ہوگا؟

لہٰذا آپ نے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور اگست ۱۹۳۲ء میں سخاوت میموریل گرلز ہائی اسکول میں نوکری کرلی۔ ۱۹۴۷ء میں جب طاہر صاحب کا انتقال ہوا تو وقت نے بتادیا کہ آپ کا فیصلہ درست تھا۔ اگر صغریٰ سبزواری اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرتیں اور اسکول میں نہ پڑھاتیں تو اس خاندان کو جس بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ وہ بصورتِ جانگسل ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں طاہر صاحب نے زیادہ مدد نہیں کی۔ ایک بار آپ نے طاہر صاحب سے مشورہ کیا تو طاہر صاحب نے جواب دیا۔ کہ مبتدی کو نہیں بناتا۔ پھر انہوں نے طاہر صاحب سے کبھی نہیں پوچھا۔ آپ نے آئی۔ اے کا امتحان آسوتوش کالج (کلکتہ یونیورسٹی) سے ریگولر اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے پاس کیا۔ بی اے کا امتحان دیا تھا لیکن بوجوہ پاس نہ کرسکیں۔

آپ کی پہلی لڑکی طاہرہ رضوی کلثوم ۲۲ سال کی عمر میں ٹی بی کے مرض میں انتقال کرگئی۔ اس کی شادی صغریٰ سبزواری کے بڑے بھائی کے بیٹے غلام علی سبزواری سے ہوئی تھی۔ طاہرہ نے میٹرک پاس کیا تھا۔ دوسرا بیٹا تھا جو پیدائش کے دو گھنٹے بعد مرگیا۔ دوسری لڑکی زہرہ رضوی نے ۱۹ سال کی عمر میں آئی اے کا امتحان دیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں امتحان دینے کے بعد چھٹیوں میں ڈھاکہ گئی تھی اور وہاں سوئی کی سوئی رہ گئی۔ سوتے میں اس کو دل کا دورہ پڑا

اس نے پلاسٹک سرجری کی اعلیٰ اسناد لیں۔ عذرا نے امریکہ میں مستقل رہائش اختیار کرلی ہے اور وہاں اس کا شمار ایک کامیاب پلاسٹک سرجن میں ہوتا ہے۔

اس طرح صغریٰ سبزداری نے نادرہ رضوی کو بھی ابوالکلام آزاد کے ذریعہ لندن بھجوایا جس طرح صغریٰ سبزداری نرم خو، شفقت و محبت کی پیکر ہیں۔ ان کی اولادیں بھی ویسی ہی ہیں آپ کی تربیت کا اثر یہ ہے کہ آپ کی ہر اولاد آپ پر جان دیتی ہے اور آپ کے ہر حکم کو بلا چون و چرا مان لیتی ہے۔ آپ کے بچے آپ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ جون ۱۹۸۳ء میں صغریٰ سبزداری کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ عذرا رضوی امریکہ سے سب کام چھوڑ کر بھاگی بھاگی کلکتہ آئی، اور ماں کی خدمت کی۔ یہاں رہ کر اس نے ان کی ڈھارس بندھائی۔ جب آپکی صحت کچھ اچھی ہو گئی تو وہ امریکہ گئی۔

آپ کی اولاد آپ سے کس قدر محبت کرتی ہے اسکی ایک مثال یہاں پیش کر رہا ہوں ۱۹۷۲ء میں جب آپ کے بڑے بیٹے جلال رضوی اور منجھلے بیٹے جمال رضوی بنگلہ دیش سے کلکتہ آئے تو جلال رضوی کے آنگن میں ایک پھول کھلا۔ چند ہفتے رہنے کے بعد ان کے دونوں بیٹے پاکستان جانے لگے تو ماں کا دل بھر آیا۔ سالوں کے بعد یکجا ہوئے تھے اب پھر جدائی ہو رہی تھی۔ آپ نے جلال سے کہا کہ نوزائیدہ بچے کو چھوڑ کر جاؤ۔ جلال اور انکی بیگم نے کچھ نہیں کہا اور بخوشی اپنے لخت جگر کو دادی کے حوالے کر کے پاکستان چلے گئے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ جس طرح طاہر رضوی صاحب کے انتقال کے بعد شفیق ماں نے بچپن میں انکی پرورش جس ناز و نعم سے کی اسی طرح اس کے اس نونہال کی بھی پرورش کریں گی۔

صغریٰ سبزداری کا کہنا تھا کہ وہ اس ننھی سی جان میں جلال کا عکس دیکھ کر انکی ڈھارس ہو گئی۔ آج وہ ننھی سی جان ۱۲ سال کا ہو چکا ہے اور اپنی دادی کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ کئی بار پاکستان جا کر اپنے ماں باپ سے مل چکا ہے اور اپنی دادی کے ساتھ ایک بار امریکہ اور یورپ کا دورہ بھی کر چکا ہے۔ وہ اس وقت کلکتہ کے ایک انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم ہے

آپ کا اصل نام سیدہ کنیز صغریٰ سبزداری اور قلمی نام صغریٰ سبزداری ہے آپ کے والد کا نام سید غلام مہدی اور والدہ کا اسم گرامی رابعہ بیگم تھا۔ آپ کے دادا سید غلام رسول سبزداری ایران سے کاروبار کے سلسلہ میں مرشد آباد مغربی بنگال آئے اور یہیں

یہ ان کی زندگی کا تاریک ترین دور تھا۔ طاہر صاحب نے اپنے پیچھے پانچ ہزار روپے قرض چھوڑے تھے ۱۹۴۷ء میں پانچ ہزار کی رقم معمولی نہیں تھی۔ سات چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اسکول کی ملازمت تھی۔ خانہ داری تھی۔ چھوٹی سی جان اور اس پر ذمہ داریوں کی بھاری بوجھ۔ قرض دینے والے آپ کو بہت تنگ کرتے تھے لیکن آپ نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ اور ہمت نہیں ہاری اور اس آفت کو ہنسی خوشی جھیل گئیں۔ باپ بن کر بچوں کی پرورش کی۔ اپنے نفس پر قابو رکھا۔ دنیا کی تمام خوشیوں کو بچوں پر نچھاور کر دیا۔ اسکول میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ گھر گھر جا کر ٹیوشن کرتیں۔ گھر میں کھانا بناتیں۔ انہوں نے طاہر رضوی صاحب کے قرض چکائے۔ ایک لگن اور دھن کی وجہ سے ان کے تمام بچے پڑھ لکھ کر سماج میں آفتاب اور ماہتاب بن گئے۔ اگرچہ ان کی زندگی کا مشن پورا ہو گیا۔ گھر میں خوشحالی آ گئی۔ لیکن صغریٰ سبزواری کے نشاط کا درخت جو مرجھایا تو پھر ہرا نہیں ہوا۔ وہ عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ان کو آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اولادیں ان سے دور بدیس میں ہیں ممکن ہے ان کی اولادیں ہر طرح سے خوش و خرم ہوں لیکن صغریٰ سبزواری پر اولاد کی جدائی کا غم ایک زخم کی طرح رس رہا ہے۔ جو ہمیشہ ان کو بے چین رکھتا ہے۔ تنہائی میں وہ روتی رہتی ہیں ان کے ساتھ صرف چھوٹا بیٹا کمال رہتا ہے۔ ان کے بچے پردیس سے آپ کی دل دہی کرتے رہتے ہیں اور ان کو روپے بھیجتے ہیں لیکن بچوں کی جدائی ان کے لئے ایک مستقل ناسور بنی ہوئی ہے۔

آپ کی چھوٹی صاحبزادی عذرا رضوی بے حد ذہین اور متین طالبہ تھی وہ ہمیشہ اپنے کلاس میں اول آتی تھی۔ عذرا رضوی نے پری یونیورسیٹی کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اور وہ میڈیکل لسٹ میں بھی پاس کر گئی تھی۔ اس کے مارکس کافی اچھے تھے۔ لیکن متعصب حکام نے عذرا کی جگہ دوسری ہندو بنگالی لڑکی کا داخلہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں کر لیا۔ عذرا کا روتے روتے برا حال تھا صغریٰ سبزواری کہاں ہمت ہارنے والی تھیں۔ آپ نے ناانصافی کے خلاف ہمیشہ جنگ کی۔ آپ نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بدھان چندر رائے سے ملاقات کی اور تمام باتیں آپ کے سامنے رکھیں۔ ڈاکٹر رائے نے کہا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ صغریٰ سبزواری نے کہا کہ آپ انصاف کیجئے۔ ڈاکٹر بدھان رائے نے جب تحقیق کی تو بات سچ نکلی۔ ڈاکٹر بدھان رائے کے حکم سے عذرا کا داخلہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں ہو گیا۔ اس طرح صغریٰ سبزواری نے اپنی پیاری بیٹی کو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں داخلہ کرایا۔ جہاں سے وہ امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوئی۔ اور بعد ازاں امریکہ جا کر

اندازہ مجھے ۱۹۷۱ء میں ہوا۔

۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے سبب پورا برصغیر جنگی بخار میں مبتلا تھا۔ مشرقی پاکستان سے ہزاروں ریفوجی مغربی پاکستان کے فوجیوں کے مظالم سے خوفزدہ ہوکر مغربی بنگال بھاگ آئے تھے ہندستان کی امن پسندی کے باوجود پاکستان جارحیت پر آمادہ ہوگیا۔ ہندوستان نے بھی مشرقی پاکستان پر حملہ کردیا۔ اور دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک بنگلہ دیش بنکر نمودار ہوا۔ بنگلہ دیش بننے سے پہلے اور بنگلہ دیش بننے کے بعد مشرقی پاکستان میں اردو بولنے والوں پر وہاں کے بنگالیوں نے جو مظالم ڈھائے۔ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہزاروں عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں کو ہلاک کردیا گیا۔ قتل گاہیں بنائی گئیں۔ جہاں اردو بولنے والوں کو بلاتخصیص عمر قتل کردیا جاتا تھا۔ پورا بنگلہ دیش جل رہا تھا۔ لوگ جان بچانے کیلئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد کلکتہ سے وہاں کسی اردو داں کا جانا زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ صغریٰ سبزواری کے بڑے اور منجھلے بیٹے جلال رضوی اور جمال رضوی مع اپنے خاندان کے وہاں محصور ہوگئے تھے۔ جب ہفتوں انکی خبر نہیں آئی تو انہوں نے بنگلہ دیش مشن آفس سے کسی طرح اجازت نامہ لے کر بنگلہ دیش گئیں۔ اس بہادر خاتون نے نہ صرف اپنے بیٹے بہوؤں، پوتوں اور پوتیوں کو بحفاظت ہندوستان لائیں، بلکہ انہوں نے سیکڑوں اردو بولنے والوں کو اپنے ساتھ ہندوستان لیکر آئیں اس طرح انکی جانیں بچیں

آپ کے شوہر پروفیسر طاہر رضوی اپنے وقت کے فارسی کے مشہور عالم اور استاد تھے آپ بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی صلاحیت کی شہرت ایران تک تھی۔ ۱۹۳۴ء میں فردوسی کے ہزارسالہ جشن کے موقع پر ایران کے شہنشاہ نے آپ کی دعوت کی تھی۔ سفر اور حضر کا پورا خرچ دیا تھا۔ آپ کی کتاب "اے پارسیز آف دی بک" کافی مقبول ہوئی۔ فردوسی کے ہزارسالہ جشن میں شرکت کیلئے طاہر رضوی کے ساتھ صغریٰ سبزواری ان کے بچے اور صغریٰ سبزواری کی والدہ بھی ایران گئی تھیں صغریٰ سبزواری کی والدہ کا انتقال دوران سفر کربلا میں ہوگیا اور آپ وہیں پیوند زمیں ہوئیں۔

۱۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو طاہر رضوی صاحب مشرقی پاکستان چلے گئے اور راج شاہی کالج میں صدر شعبۂ فارسی و عربی ہوگئے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنے بچوں سے ملاقات کرنے کیلئے کلکتہ آئے اور ۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو شدید دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے۔

طاہر صاحب کے انتقال کے بعد صغریٰ سبزواری پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بقول انکے

صغریٰ سبزداری حیات و کارنامے

پروفیسر
مشتاق احمد

صغریٰ سبزداری کا شمار کلکتہ کی اہم خواتین قلم کاروں میں ہوتا ہے صغریٰ سبزداری نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ آپنے افسانے اور مقالے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی۔ ہندی اور انگریزی کے ادب پاروں کا ترجمہ بھی کیا۔ آپنے درسی کتابیں بھی لکھی ہیں جو ایک زمانے تک کلکتہ کے مختلف اسکولوں کے نصاب میں داخل رہی ہیں۔ صغریٰ سبزداری کو کلکتہ کی اہل قلم خواتین پر ان معنوں میں فوقیت حاصل ہے کہ تقریباً ہر صنفِ ادب پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

صغریٰ سبزداری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۰ء میں ان کے دولت کدے پر ہوئی۔ اس زمانے میں بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء نامی کتاب ترتیب دے رہا تھا۔ بوٹے سے قد کی متاثر کرنے والی شخصیت دل کھول کر ملی تھی۔ اس زمانے میں آپ امریکہ اور یورپ کا دورہ کرکے آئی تھیں۔ ساتھ میں حج بھی کیا تھا۔ آپ نے اپنے سفر کا قصہ بڑے دلکش انداز میں بیان کیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ اس طرح ملیں جیسے برسوں سے جانتی ہوں۔ باتوں میں غرور تھا نہ تصنع۔ پھر ان سے تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے۔ میں جب بھی ان کے دولت کدے پر گیا وہ کھل کر ملیں اور گھنٹوں نصیحتیں کرتی رہیں۔

صغریٰ سبزداری چٹان کی طرح اٹل رہنے والی خاتون ہیں۔ آپ کی زندگی مسرت و مسرت کی دلچسپ کہانی پیش کرتی ہے۔ آپ نے جہاں عروج کی صبح دیکھی وہیں زوال کی شام بھی دیکھی۔ آپ دیکھنے میں اگرچہ چھوٹی سی لگتی ہیں لیکن آپ بے انتہا نڈر اور ہمت ور خاتون ہیں اس کا

کا مندر دراصل استعارہ ہے۔ اس مذہبی نظام کا جو صدیوں سے ہندوستانی ذہن پر راج کرتا چلا آرہا ہے۔ اور اس نے بستیاں بسائی ہیں لیکن دل نہیں بسایا۔

کہانی شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ دلچسپی سے عاری نہیں ملے گی۔ یہ دلچسپی لفظی بازیگری کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ رومانی فضا بندی کا نمونہ بلکہ اسمیں حقیقت کو ابھارنے اور اثر انگیز بنانے کی خاطر بیدی نے کم سے کم الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ بیدی کی کہانیاں کسی قاعدہ قانون کی پابند نہیں۔ دل کی پابند ہوتی ہیں۔ ان کے Contents ازخود فارم بنا لیتے ہیں۔ یہ فارم لیک ہی انداز سے بیدی کی تمام کہانیوں میں نہیں پائے جاتے بالفاظ دیگر بیدی کی کہانیاں تکنکی اعتبار سے ایک ہی سانچے میں ڈھلی نظر نہیں آتیں۔ بلکہ ان کے خیالات نئی ہیئت بنا لیتے ہیں۔ ان کے یہاں کہانی سنانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ قصہ گوئی ہندوستان کا پرانا فن ہے۔ پریم چند نے اس روایت کو زندہ رکھا تھا۔ جدیدیوں کے یہاں یہ روایت تقریباً ختم ہو گئی کہ کہانی اب سنانے کی چیز نہیں۔ بلکہ اکیلے میں سوچنے کی چیز رہ گئی ہے۔ غور و فکر کو دعوت دینا کوئی عیب کی بات نہیں۔ لیکن اس عمل کے لئے اکیلا ہو جانا کچھ زیادہ صحت مند طریقہ نہیں کہ کہانی کا تعلق سماجی زندگی سے گہرا ہوتا ہے اور کہانی کار سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اسلئے اسکی تنہائی بھی سماجی حقیقت کی آئینہ دار ہونی چاہیئے۔ بیدی کے یہاں اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ بھرے پرے سماج کا ایک فرد ہے جس نے ہزارہا نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ اور انہیں کہانی کا روپ دیا ہے۔ لاجونتی بھی ایک عورت کی کہانی ہوتے ہوئے تمام عورتوں کی کہانی بن جاتی ہے جو عورت کے اصل مقام کو ابھارتی ہے اور وہ مقام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عورت بنیادی طور پر اپنا حق چاہتی ہے بیوی اور ماں بن کر۔ دیوی بن کر رہنا اس کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اور لاجونتی کی آنکھوں سے آنسو نکلنے کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ ہر حال میں دیوی بنکر رہنا نہیں چاہتی۔

یوں تو فسادات پر مبنی بہت سی کہانیاں ہیں لیکن بیدی کی یہ ایک ایسی کہانی ہے جو گہرا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتی ہے۔

ایک رات وہ لاجو سے کہتا ہے۔

"کون تھا وہ"؟

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔ "جمّاں" پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سندر لال نے پوچھ لیا۔

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟

"ہاں"

"مارتا تو نہیں تھا؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا "نہیں تو"۔۔۔۔ اور پھر بولی۔ "اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اگرچہ وہ مارتا نہیں تھا۔ پر مجھے اس سے بہت زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پھر بھی تم سے ڈرتی نہیں تھی۔ اب تو نہ مارو گے؟

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا۔

"نہیں دیوی۔ اب نہیں ماروں گا۔ نہیں ماروں گا۔"

"دیوی" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

لاجونتی اسلئے روتی ہے کہ عورت مغویہ ہو کر یا گر بھی عورت رہنا چاہتی ہے۔ وہ دیوی کے مقابلے میں بیوی بننا زیادہ پسند کرتی ہے کہ اس کے اندر ماں چھپی رہتی ہے۔ عورت کوئی بُرا ہو اور کچھ بھی ہو اس کا صحیح اور فطری روپ ماں کا ہے۔ عورت بیوی ہو یا بیٹی بنیادی طور پر ماں ہے اور ماں بننا پسند کرتی ہے۔ اگر یہ درجہ اسے نہیں ملتا تو تاسف کی جھیل میں ابھرتی ڈوبتی رہتی ہے۔

لاجونتی ایک مغویہ عورت کے کردار پر مبنی خوبصورت کہانی ہے جسے تقسیم ملک کے بعد فساد کے پس منظر میں ابھارا گیا ہے۔ اس کا دھیما اور سبک و نرم لہجہ سہمی ہوئی فضا اور بستی بسانے کمیٹی کے بعد دل بسانے کی تحریک اور ان تمام اجزا کے امتزاج سے ابھرتی ہوئی ایک مظلوم عورت۔ لاجو۔ جو ادھوری رہ گئی۔ کچھ اس انداز سے اس کہانی میں پیوست ہیں۔ جو بیدی کو ایک بڑا فن کار بناتے ہیں۔ اس کہانی میں نارائن باوا کا

دوشیزہ پر بھی۔ دختر دہقاں پر بھی جاتی ہے اور ان مریضوں پر بھی جو موت و حیات کے درمیان کھڑے ہیں لیکن ہر جگہ ان میں چھپی ہوئی انسانیت تلاش کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کا کردار بھرپور زندگی کے ساتھ ابھرتا ہے۔

بیدی کی نفسیاتی گرفت اتنی شدید ہے کہ وہ کوئی ایسا نکتہ برآمد کر لیتے ہیں جو شخصیت کی تعمیر میں معاونت کرتا ہے۔ لاجونتی ان کی ایک معرکۃ الآرا کہانی ہے جسے تقسیم ملک کے پس منظر میں ابھارا گیا ہے۔ لاجونتی ایک مغویہ عورت ہے جسے تقسیم ملک کے دوران اسکی قسمت کسی مرد کے ساتھ پاکستان پہنچا دیتی ہے۔ کئی برس کے بعد وہ پھر ہندوستان لوٹتی ہے۔ اس کا شوہر سندر لال جو اسے بے پناہ چاہتا تھا اور اس کی جدائی میں بے حد مضطرب تھا۔ دل بساؤ کمیٹی کا سرگرم رکن ہو جاتا ہے۔ لاجونتی ایک نرم نازک سی خاتون تھی۔ شہوت کی پتلی۔ یہ سندر لال کے من کی دنیا میں اسوقت بھی عفریت ڈال دیتی ہے۔ جب وہ اس سے کوسوں دور ہے اور سندر لال دل بساؤ کمیٹی میں کہیں زیادہ سرگرم رہتا ہے۔ یہ کمیٹی اشاریہ ہے بیدی کے بنیادی موقف کے اظہار کا۔ تاریخ واضح کرتی ہے کہ تقسیم ملک نے جہاں زمینوں اور سرحدوں کا بٹوارہ کیا تھا وہاں دلوں اور رشتوں کا بھی بٹوارہ کر دیا تھا کتنی آرزوئیں تقسیم ہو چکی تھیں۔ کتنی خواہشیں سیاسی بازیگری کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ اور سندر لال کی محبت بھی قربان ہو گئی تھی۔ اس کا بسا بسایا گھر اجڑ گیا تھا۔ وہ ایک باشعور ہمدرد انسان تھا۔ وہ خون کے طوفان کے بعد مغویہ عورت کے بساؤ کی تحریک چلاتا ہے اور جب ایک دن لاجو مل جاتی ہے تو وہ اپنے گھر لے آتا ہے۔ پھر بھی وہ دل بساؤ کمیٹی میں کام کرتا رہتا ہے۔ سندر لال کی اس ادا پر لاجونتی قربان ہو جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اسے یہ بات بھی کھائے جاتی ہے کہ اس کا شوہر اس سے کیوں نہ پوچھ سکا کہ وہ کسی غیر مرد کے ساتھ کیوں تھی؟ وہ اکثر اپنی روداد سنانا چاہتی ہے لیکن شوہر کے بار ہا ٹال جانے کی وجہ سے کچھ بھی بتانے سے قاصر رہتی ہے۔ ادھر سندر لال کے اندر کا وہ مرد جبلی طور پر ابھرتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کی باہنوں میں ڈھلتے نہ دیکھ سکے یا سن سکے۔ چنانچہ وہ لاجونتی کو دیوی کا روپ دے دیتا ہے۔

بیدی کی کہانی
لاجونتی ایک جائزہ

★ ڈاکٹر عبدالمنان استاذ شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی

اردو افسانہ نگاری میں پریم چند اور منٹو کے بعد جو نام پورے وقار کے ساتھ جلوہ گر ہوا وہ راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔ بیدی ان فن کاروں میں ہیں جو فن کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ اور یہ ترجمانی لفظوں کے تموج میں ابھرتی ڈوبتی نہیں اور نہ ہی فن کی آنکھ مجولیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ بیدی کو زندگی کے ہزار شیوۂ حسن سے پیار ہے اور وہ اسی پیار کی خاطر حقائق حیات کی وادیوں میں بھٹکتے ہیں۔ مسائل کے ریگستان میں حادثوں کے بگولے کی زد میں آتے ہیں۔ اور جب آگے بڑھتے ہیں تو ان کا چہرہ گرد آلود نظر آتا ہے جسم زخموں سے چور دکھائی دیتا ہے اور ماتھے پر فکر کی ریکھائیں نظر آتی ہیں۔ جس کی تہوں میں انسانیت سے محبت کی داستان چھپی ہوتی ہے اور یہ داستان کبھی گرم کوٹ کا روپ دھار لیتی ہے۔ کبھی دس منٹ بارش میں بھیگ جاتی ہے، کبھی لاجونتی کی شکل اختیار کرتی اور کبھی ایک میلی سی چادر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے۔ جہاں سے بیدی کی کہانیاں پھیل کر دائرے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس دائرے کے اندر ترقی پسند تحریک کی مثبت اقدار دکھائی دیتی ہیں کہ بیدی نے اپنی کہانیوں کا آغاز ترقی پسند تحریک کے دور میں کیا تھا اور ترقی پسندوں نے جس نظریۂ حیات کو محور بنایا تھا۔ بیدی نے بھی اپنایا تھا لیکن ان کی نظر انتخابی تھی اور لہجہ نرم و نازک۔ بیدی کی نظر طوائف پر بھی پڑتی ہے اور معصوم الہڑ

ڈاکٹر ظفر بھی چند لمحے اسپتال میں رات دیر تک رہے تھے۔ ان کو اور دوسرے ڈاکٹروں کا اندازہ تھا کہ مریضہ کی حالت میں افاقہ ہے۔ یہ افاقہ یوں تھا کہ آکسیجن لگی ہوئی تھی بے ہوشی طاری تھی پھر بھی ڈاکٹروں کے خیال میں صورت حال بہتر تھی۔ اسلئے تحسین نے حسیب خالو کے علاوہ سبھوں کو اسپتال سے واپس کر دیا۔ سبھوں نے ایک سکون کا سانس لیا تھا۔ اور واپس چلے آئے تھے۔ اور اب صبح صبح منظر نامہ بدل چکا تھا۔ ڈاکٹر ظفر کی بہن، ان کی والدہ اور روشن، خود حسیب خالو اور ڈاکٹر ظفر ایک ساتھ اوپر گئے۔ حسیب خالو دروازہ پر ایک لمحے کو رُکے اور پھر انہوں نے کال بیل دبا دی۔ اب صبح کے ۶ بج چکے تھے۔ مقبول نانا نے خود ہی دروازہ کھولا۔ اور اتنے سارے چہروں کو اچانک ایک ساتھ دیکھکر بن کہے وہ سب سمجھ گئے۔ اور سارے چہروں کی خاموشیاں نانا کے اندر ایک ایک کر کے اترتی چلی گئیں۔ اور اسی لمحے یہ بھی ہوا کہ ان کی وہ فطری شگفتگی جو ان کے کردار کا ایک مخصوص جز تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ ویسے شگفتگی کا اظہار اب بھی ہوا کرتا ہے مگر اب یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس شگفتگی کی جڑیں جیسے سوکھ چکی ہوں۔

یوں تو آج کے کاروباری دور میں ہر ایک دردمندی کا دعویٰ ضرور کرتا ہے مگر مقبول نانا کے متعلق وثوق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے دعویٰ کبھی نہیں کیا لیکن دردمندی کے عملی ثبوت انہوں نے بارہا فراہم کئے ہیں۔ بہرحال ہے یہ حقیقت کہ دور و نزدیک سے قطع نظر کوئی بھی ان سے کسی بھی جہت ان کے اس قیمتی خزانے سے لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ میں ان کے ایک عزیز کو جانتا ہوں وہ کلکتے ہی میں ہیں۔ اپنے علاقے میں کبھی نیک نام نہیں رہے۔ اب جبکہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں کسی کے لئے نقصان دہ نہیں رہے ہیں۔ اس کے باوجود آج بھی لوگ ان سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں لیکن مقبول نانا ہیں کہ انہوں نے پہلے بھی ان سے ملنے میں جھجک محسوس نہیں کی۔ اور آج تو خیر وہ ہمدردی کے مستحق ہی ٹھہرے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ان عزیز ممدوح کی بعض غلط حرکتوں سے مقبول نانا کو نہ صرف یہ کہ ذہنی الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا بلکہ شرمسار بھی ہونا پڑا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے عزیز کو عزیز سمجھ کر ان کے ذاتی اور گھریلو مسائل کو حل کرنے میں حد سے زیادہ دلچسپی لی۔ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف ہوتے ہوئے میں نے مقبول نانا ہی کے یہاں دیکھا ہے۔ میرے گھر میں کوئی بھی بیمار رہتا مقبول نانا کو خبر ہو جاتی۔ تو فوراً چلے آتے۔ کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ تحسین دن بھر کئی اسپتالوں چیمبروں میں اپنی ڈیوٹی کے بعد دس بجے رات کو گھر لوٹے تو مقبول نانا نے

باقی ص ۳۹ پر

اور بہت شان سے آئی۔ عید کر کے وہ پھر چترنجن اسپتال ایسے گئیں جیسے کہیں پکنک پر جا رہی ہوں۔ اور عید کے بعد ایک روز ان کو آپریشن کیلئے تیار کیا گیا۔ میں بھی روشن کے ساتھ اسپتال پہنچ چکا تھا۔ مقبول نانا کی بڑی بیٹی شہناز خالہ اور ان کے شوہر حسیب خالو بھی جمشید پور سے آ چکے تھے۔ تحسین تھے اور فردوس بھی۔ اور جانے کتنے اپنے پرائے لوگوں کے درمیان مقبول نانا کی شخصیت کچھ اس طرح لگ رہی تھی جیسے پہاڑ پر چڑھتا ہوا سورج آپریشن تھیٹر تیسری منزل پر تھا۔ اور نانی کا کیبن دوسری منزل پر۔ ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ دوسری منزل پر لفٹ رکی کھڑی تھی۔ ہم سبھوں نے کتنے بوجھل دل کے ساتھ دیکھا کہ نانی لفٹ پر اپنے ڈاکٹر بیٹے کے ساتھ اوپر اٹھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ اور ہاتھ کے اشارے سے ہم سبھوں کو آخری بار انہوں نے جس طرح وداع کہا تھا اس منظر کو آج بھی یاد کر کے آنکھوں کی جھیل کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اس پورے منظر نامہ میں مقبول نانا کے چہرے پر میں نے کملاہٹ کا میل نہیں دیکھا ہم سب پگھل رہے تھے مگر وہ کرب کی شدید تمازت میں بھی خود کو بچائے رکھنے میں کامیاب تھے۔ اور آپریشن کے بعد جب نانی کو ان کے کیبن میں واپس لایا گیا تو وہ اس وقت بھی ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ ان کو ہوش میں لانے کی ساری کاوشیں بے اثر ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے مایوسی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور سبھوں کے ساتھ جب ڈاکٹر تحسین بھی مضمحل ہونے لگے تو ہم نے یہ بھی دیکھا کہ نانا نے اس وقت بھی اپنے بیٹے کی ہمت بندھائی۔ اور پھر وہ آخری گھڑی بھی آ ہی گئی۔ صبح کے ساڑھے تین بجے ہوں گے۔ سب گہری نیند میں تھے۔ ہمارے فلیٹ کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دستک میں تیزی اور تندی بھی تھی۔ شاید ایک ایک کر کے ہم سب اٹھ بیٹھے تھے مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی حادثہ ہے جو دبے پاؤں آ چکا ہے۔ میرے دروازہ کھولتے ہی حسیب خالو (نانا کے بڑے داماد) نے اس جانکاہ حادثے کی تصدیق کر دی تھی مگر اب ہم سبھوں کے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ تھا کہ نانا کو یہ خبر کس طرح سنائی جائے طے پایا کہ حسیب خالو کے ساتھ روشن بھی جائیں گی۔ یہ قافلہ ۱۶ ای ویلسلی پہنچا۔ دوسری منزل پر ڈاکٹر ظفر رہتے تھے۔ سب سے پہلے ان کے گھر میں یہ خبر دی گئی۔ خود

کی طرح لگتی تھی۔ رشیدہ کی ماں اپنی بیٹی کو اس گھر میں رکھکر بہت ہی چین کی نیند سوئی ہوگی۔ دو تین برسوں کے بعد معلوم ہوا کہ رشیدہ کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کی ماں نے لڑکا دیکھ کر رشتہ طے کر دیا تھا۔ اس دوران نانی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اسلئے سب کچھ نانا ہی کو کرنا تھا۔ چوتھی کے کپڑے بنائے گئے۔ زیور خریدے گئے پھر رشیدہ کی رخصتی کے بعد لگا کہ۔۔ مقبول نانا نے جیسے اپنی ہی لڑکی کو رخصتی کی ہو۔ ہر وقت رشیدہ کی تعریف۔ اسکی خوبیوں کی چرچا۔ اس اپنائیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ رشیدہ کے جانے کے بعد رشیدہ کی چھوٹی بہن آگئی اور وہ گئی تو اسکی ماں ہی چلی آئی۔

مقبول نانا کو جنہوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا ہے کہ ان کے اندر ننھے فرشتے کی معصومیت کا بار بار اظہار ہوتا رہا ہے۔ اس معصومیت میں اس وقت تک ایک زبردست شگفتگی تھی۔ جب تک نانی مرحومہ نے ان کا ساتھ نبھایا۔ گھریلو الجھنوں سے بے فکر بچنے کی جائیداد کے مسائل سے بے تعلق۔ یہ سارا کچھ یوں تھا کہ نانی نے بہت ہی دور بینی اور جگرداری کے ساتھ نانا کی صحیح رفاقت کا مفہوم ادا کیا تھا۔ ایسے میں مقبول نانا تھے۔ ان کا مطالعہ تھا۔ کبھی دیہاتی محاورے پر کام کر رہے ہیں۔ کبھی دوسرے ادبی مسائل پر زور تحقیق صرف کر رہے ہیں کبھی شیخپورہ کی علمی ادبی شخصیتوں کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ اور کبھی مگدھی زبان کی موجودہ ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لی جا رہی ہے۔ قاضی عبدالودود سے سلسلہ مراسلت ہے۔ پروفیسر سید حسن صاحب کے علمی خطوں کے جواب لکھے جا رہے ہیں۔ اور اگر علامہ جمیل مظہری کلکتے میں مقیم ہیں تو گھنٹوں ان کے ہاں بیٹھ کر عظیم آباد کے کلاسیکی شعراء کے بھولے بسرے اشعار کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ غرض کہ نانا کی زندگی میں ہر وقت علم و ادب کی بازگشت تھی۔ ہر جگہ طمانیت تھی۔ ایک شگفتہ کاری تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ نانا کی اس زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ نانی کو کینسر ہو گیا۔ آپریشن طے پایا۔ شاہ تحسین مکمل طور پر ڈاکٹر ہو چکے تھے مگر ابھی بھی وہ نیشنل میڈیکل اسپتال سے وابستہ تھے۔ اسلئے وہ اپنی والدہ کو یہاں لے آئے۔ خیال تھا کہ عید کے بعد آپریشن ہوگا۔ رمضان کا آخری ہفتہ تھا۔ نانی نے سوچا ہوگا کہ عید کی تیاری جو ادھوری رہ گئی تھی۔ بیچاری فردوس (مقبول نانا کی چھوٹی صاحبزادی) کیسے مکمل کر پائے گی۔ یہ سوچ کر نانی اسپتال سے عید سے دو دن پہلے گھر چلی آئیں۔ پھر عید آئی

کھول کر ٹیبل کے نیچے سرکائے۔ اور دونوں پاؤں چڑھا کر صوفے میں دراز ہو گئے۔ دس پندرہ منٹ کا ایک وقفہ۔ پھر شرٹ بھی اتر جائے گی اور اس کو بہت احتیاط کے ساتھ ٹیبل پر ہی رکھیں گے۔ اور ساتھ میں خبروں کا خزانہ انڈیلا جاتا رہے گا۔ اور میں ہاں، ہوں کے ساتھ موصوف کا ساتھ دیتا رہوں گا۔ ماحضر پر بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا اس کے بعد میں قیلولہ کے خیال سے لیٹ جاتا ہوں۔ ادھر موصوف بھی بڑے آرام کے ساتھ صوفے میں دھنسے۔ نیم غنودگی کے عالم میں پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ اور جب سورج دن بھر کے سفر کے بعد تھکنے لگتا ہے تو موصوف تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اُٹھ کر بیٹھیں گے۔ پیروں میں جوتے ڈالیں گے فیتے کسیں گے اور پھر ٹیبل پر سے شرٹ اٹھا کر پہننے سے پہلے اعلان کریں گے "اب چلنا چاہیئے"۔۔۔ میں جواباً عرض کروں گا کہ چائے تو پیتے جائیے"۔ یہ سن کر شرٹ پھر ٹیبل پر اور چائے کا انتظار۔

مقبول نانا نے میرے اصرار کے باوجود اپنے ان موصوف کا نام نہیں بتایا اور میں نے یہ سوچ کر نام جاننے کیلئے مزید کرید بھی نہیں کی کہ معصوم نانا کی معصوم شرافت کے برگد کی چھاؤں میں اس طرح جانے کتنے تھکے ہارے مسافروں نے دن کی شدید تمازت میں آرام کیا ہوگا۔

ایک بار میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مقبول نانا اپنے فلیٹ کے باہر سیڑھیوں کے پاس کھڑے ایک مفلوک الحال بوڑھے کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد نانا نے بتایا کہ وہ بیکر ہوسٹل کے ملازم تھے اور میں ان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں بیکر ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ بیچارہ اب بھی آجاتا ہے خیریت پوچھنے اور خیریت پوچھنے کی تفہیم اس کے سوا اور کیا تھی کہ وہ آج تک ان کی مالی مدد کرتے رہے تھے یا مالی مدد کی بات لیوں ہے کہ ان کے گھر میں آج بھی ڈائمنڈ ہاربر کی ایک بوا ہے۔ رشیدہ کی ماں ہم جانتے ہیں کہ رشیدہ جب دس سال کی رہی ہوگی۔ اس کی ماں مرحومہ نانی کو اپنی بیٹی دیگئی تھی۔ اب نانا کے یہاں پروان چڑھنے لگی۔ مہینے دو مہینے میں اس کی ماں آجاتی اور بیٹی کو دیکھ جاتی۔ رشیدہ کو دیکھ کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ گھر کی آیا ہے۔ دھلے دھلائے صاف کپڑوں میں ایک صحت مند لڑکی نانا کے چھوٹے سے کنبے میں ایک فرد

مجھے دیکھتے ہی بتانے لگے کہ کل کن حالات میں ان سے وعدہ خلافی ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ کل ساڑھے بارہ کے قریب جب میں کھانے پر بیٹھنے ہی جارہا تھا کہ ایک پرانے رفیق چلے آئے۔ سوچا کہ ان سے دو چار منٹ باتیں کرلوں تو کھانا کھاؤں گا۔ رشیدہ کی ماں دسترخوان اٹھا کر واپس لے گئی۔ رفیق محترم نے جوتے کھولے اور بہت ہی اطمینان کے ساتھ صوفے میں وہ اس طرح نیم دراز ہوئے کہ مجھے صوفے پر ترس آگیا۔ پھر انہوں نے پورے کلکتے کی، کلکتے کے اردو حلقے کی خیریت سنانی شروع کردی۔ ایک بجا۔ دو بجا۔ نانا نے بتایا کہ وہ ایک بجے کھانا کھا لیا کرتے ہیں اور اب کافی دیر ہوچکی تھی اور دوسری طرف خیریت نامہ ختم ہونے کو نہیں تھا۔ اسلئے میں نے موصوف سے کہا کہ کھانا کھا لیجئے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ جواب میں رفیق نے کہا کہ ہاں منگا لیجئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں دن میں تو گھر پر کھاتا ہی نہیں ہوں۔

نانا نے مجھ سے کہا کہ یہ سوچکر کہ اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے کھانا کھا کر موصوف چلے جائیں گے تو میں شمس الہدیٰ روڈ کی طرف نکل چلوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ میرے کرم فرما کھانے سے فراغت کے بعد پھر صوفے میں دھنس گئے۔ یہ سارا واقعہ نانا جس انداز میں بیان کررہے تھے۔ اس میں شگفتگی، طنز اور بھولاپن تھا۔ یہ سب کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے نئے سرے سے ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ کھینچنا شروع کردیا ہو۔ ہم سب ہنستے ہنستے دوہرے ہورہے تھے۔ مقبول نانا نے بتایا کہ ان کے یہ رفیق تقریباً اسی وقت ان کے گھر آجایا کرتے ہیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ میں کس وقت کھانا کھاؤں گا۔ کس وقت قیلولہ کروں گا یا یہ کہ مجھے رفیق محترم کے ساتھ گفتگو سے بھی زیادہ بعض اہم کام ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گرمیوں میں موصوف کی نظر کرم کچھ زیادہ ہی ہوا کرتی ہے اب دیکھئے مقبول نانا کا انداز بیان ۔

" ادھر گھڑی نے بارہ بجائے ادھر کال بیل کی لمبی سیپ۔ سیپ۔ سیپ نے ہمیں چونکا دیا۔ سمجھ گئے کہ حضرت موصوف کی آمد آمد ہے۔ دروازہ کھولا۔ اندازہ غلط نہیں تھا۔ یہ تمنا ہی رہ گئی کہ ہمارا اندازہ غلط نکلے۔ آئیے آئیے! آپ ہی کا انتظار تھا۔ کیا حال ہے؟ باہر گرمی تو کافی ہوگی۔ آتے ہی موصوف نے جوتے کے فیتے ڈھیلے کئے۔ جوتے

سلامی وضع کیساتھ بیٹھے ہیں اور ان کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ رات یہیں گزار دینگے۔ مجھے معلوم ہے کہ نانا رات میں سوکر سو جانے کے عادی ہیں۔ کھانا کھا کر وہ لائٹ آف کر دیا کرتے ہیں۔ بستر پر لیٹتے ہی بغل میں رکھے ٹرانسسٹر کو آن کر دیا کرتے ہیں۔ مختلف اسٹیشنوں سے خبریں اور جائزے سنتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا معمول بن چکا ہے۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت کسی کی موجودگی سے ان کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس کے باوجود میں نے بھی نانا سے ملنے کیلئے یہی وقت چنا تھا کہ ایک اہم مسئلہ تھا اور ان سے تنہائی میں بات کرنے کیلئے یہی ایک وقت تھا۔ یہ جان کر بھی کہ اس وقت ان کے آرام کا وقت ہے میں چلا آیا تھا روشنی تھی اور ریڈیو خاموش تھا۔ نانا کے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے یہ احساس بہرحال ہو گیا کہ غیر معمولی صورت حال ہے۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ نانا اپنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور ان کی انگلیاں بار بار غیر شعوری طور پر سرہانے میں تکیہ کے پاس رکھے ہوئے چھوٹے سے ریڈیو کو چھو رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر نانا کو اندر سے ضرور ناگوار گذرا ہوگا کہ ایک نہ شد دو شد۔ لیکن انہوں نے اس وقت جس طرح میرا استقبال کیا اس سے اندازہ ہوا کہ وہ جس ٹنشن میں مبتلا تھے شاید اسمیں کسی حد تک کمی آگئی ہے۔ میں جیسے ہی بیٹھا۔ نانا نے مجھ سے موصوف کا تعارف کرایا۔ آپ زبردست ریاضی داں ہیں۔ ریلوے میں انجنیئر ہیں۔ اسلام کا بھرپور درد رکھتے ہیں۔ آپ نے موجودہ معاشرے میں اسلامی تعلیمات کی ضرورت پر ایک مفید کتاب لکھی ہے۔ مجھے انہوں نے ابھی ابھی ایک حصہ سنایا ہے۔ میں اسکو پڑھونگا۔ آپ بھی اس کا مطالعہ کیجئے۔ مقبول نانا اس تعارف کے بعد خاموش ہو گئے تو انجنیئر صاحب خود ہی شروع ہو گئے۔ ان کے شروع ہونے کا انداز اس قدر خطرناک تھا کہ میں نے رخصت چاہی، اور نانا کو انجنیئر صاحب کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا آیا۔

ایک بار اتوار کو مقبول نانا ہمارے یہاں آنے والے تھے انہوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ڈھائی تین بجے آنے کی بات تھی۔ اتوار کو جب کھانے کے بعد گھڑی دیکھی تو تین بج چکے تھے اس کے بعد ہی میرے ساتھ پورا گھر نانا کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب شام ہو گئی اور چھ بج گئے۔ تو ہم مایوس ہو گئے اور یہ سوچ کر کہ اچانک کسی مصروفیت کی وجہ سے نانا ہمارے یہاں نہیں آسکے ہوں گے۔ ہم نے ان کا انتظار چھوڑ دیا۔ دوسرے روز جب میں چھ بجے شام کے لگ بھگ یونیورسٹی سے گھر لوٹا تو دیکھا کہ نانا موجود ہیں اور بچوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔

وہ "خیریت پوچھنے" کی نیت سے آئے۔ اب پروفیسر مقبول صاحب نے رازداری کے حدود سے نکل کر محترم کو "خیریت" بتادی۔ اس خیریت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک کان بیابان اور پروفیسر مقبول صاحب کو "اس خیریت" بتانے کی قیمت یوں چکانی پڑی کہ پھر اس ادارے نے ان کے پاس پرچے بھیجنا ہی بند کردیا اسطرح وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا رہے اور اپنا نقصان کرتے رہے ہیں لیکن کیا کیجئے کہ کردار میں معنویت اور جاذبیت تو سود و زیاں کی مساوات سے اوپر اٹھکر ہی حاصل ہوتی ہے۔ مقبول نانا نے کسی کا دل دکھایا ہو۔ میں نہیں جانتا ہوں اور جب سے میں ان کو جانتا ہوں۔ کوئی ایسا شخص ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا جو بتا سکے کہ شاہ صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کو نقصان پہنچایا ہو۔ ویسے ان کی سادہ لوحی سے وقتی طور پر یونیورسیٹی نتائج کی اشاعت کے بعد بعض طلبہ اور طالبات کو کبھی کبھار ہلکی سی بدظنی ضرور ہوئی ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ اردو کی بدنصیبی ہے یا خوش نصیبی کہ اردو ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے بعد ہر کوئی ناکس خود کو فرسٹ کلاس کا حق دار سمجھتا ہے۔ اور پابندی کے ساتھ کلاس کرنے کی صورت میں پہلی پوزیشن کا بزعم خود وہ مستحق ہوجایا کرتا ہے اور تیسری قسم ان پرائیویٹ امیدواروں کی ہوا کرتی ہے۔ صحیح اردو لکھنا جن کے لئے کم مائیگی کی علامت ہے۔ لیکن وہ قوم کے فرد ہیں اسلئے قوم کے نام پر ان سبھوں کیلئے سکنڈ کلاس کی رجسٹری ہوہی چکی ہے لہذا اس صورت حال میں بدگمانیوں کا پیدا ہونا ایک فطری اور معمولی امر ہے لیکن مقبول نانا کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ فائدہ بھی پہنچاتے ہیں اور درد بھی سہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ اس طرح معمولی اور وقتی بدگمانیوں کو بھی زبردست اہمیت دیا کرتے ہیں۔ ان کا دل دکھتا ہے کہ وہ قوم کے ہونہاروں کیلئے اتنا کچھ کرنے کے باوجود یہ "فرزندان قوم" ان سے بدظن ہوجاتے ہیں۔ مقبول نانا ایک خلش کی کیفیت کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں کبھی کسی رفیق کار کے پاس اور کبھی میرے پاس آکر اس دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ میں ان کے اس دکھ میں اس احساس کے ساتھ شریک ہوجاتا ہوں کہ آج کے احسان ناشناس معاشرہ میں ہر ایک کو اہمیت دینا کہاں کی سودمندی ہے۔

لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شاہ صاحب کی کردارسازی جس سطح پر ہوئی ہے وہاں تو ہر ہر قدم دیکھ کر اٹھایا جاتا ہے کہ کہیں پاؤں کے نیچے کوئی چیونٹی نہ آجائے۔

مقبول نانا کی معصوم دوستداری کو میں نے بارہا مرحلۂ آزمائش سے گذرتے بھی دیکھا ہے اور ایسا اسلئے بھی ہوا ہے کہ ان کے ملنے جلنے والوں کی فہرست میں بھانت بھانت کے لوگ دیکھے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ ایک صاحب رات کو ۹ بجے نانا کے کمرے میں اپنی زبردست

کے ہجوم میں گھرا ہوا دیکھ کر بوڑھے تو بوڑھے جوان مدرسین بھی شاہ صاحب کی مقبولیت پر رشک کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ رشک وحسد تو آج کا مزاج ہے کہ ہم ہیں کچھ نہیں اور چاہتے سب کچھ ہیں۔ حالانکہ موجودہ تجارتی معاشرے میں بھی خرید و فروخت کے کچھ اصول وضوابط ہوا کرتے ہیں سب کچھ بیچا جاسکتا ہے اور سب کچھ خریدا جاسکتا ہے لیکن دکھ کی بات تو یہ ہے کہ جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے وہ بھی اپنے کاروبار کو چلا لیا کرتے ہیں۔ مگر اس کاروباری نقطۂ نظر کے باوجود دانش کا ہوں کی منڈیوں میں خرید و فروخت کو آگے بڑھانے والے لوگ شاہ صاحب کے غیر کاروباری کردار کو دیکھ کر اپنے آپ سے کڑھتے رہتے ہیں کہ اس کے علاوہ اور وہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

شاہ صاحب سے میری قرابت داری بھی ہے۔ وہ میری اہلیہ کے ایک جہت سے نانا ہیں اس لحاظ سے میں یہ فخر کرنے میں حق بجانب ہوں کہ ایک عزیز کی حیثیت سے مجھے پچھلے پندرہ سولہ برسوں میں ان کو کچھ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ لیکن اس قربت کے باوجود جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ دوسروں کے نتائج سے مختلف بھی نہیں ہیں۔ یعنی میں نے ان کی شخصیت کو جس طرح لیا ہے ان کے کرداروں کے حوالے سے کم وبیش وہی تاثرات دوسرے کے یہاں بھی مل جائیں گے۔ ایسا اسلئے ہے کہ مقبول نانا کی شخصیت دوہرے معیار کی نہیں ہے۔ وہ ایک چہرہ آدمی ہیں اور ایک بچے کی طرح معصوم بھی۔ وہ کھلی کتاب ہیں، جہاں سے چاہئے ان کو پڑھ لیجئے اور اگر آپ ان کو پڑھنا نہیں بھی چاہیں تو وہ خود ہی اپنے آپ کو پڑھ کر سنا دیں گے۔ لوگ جانتے ہیں کہ پروفیسر مقبول صاحب کے یہاں کوئی بھی بات راز نہیں ہوا کرتی ہے ویسے بھی ہندوستان کے موجودہ معاشرہ میں استاذ اور وہ بھی اردو کے استاذ کے یہاں کوئی ایسی صورت حال پیدا ہی نہیں ہوا کرتی ہے جس میں وہ خود کو یا اپنے بعض معاملات کو چھپانے کی کوشش کرے پھر بھی یونیورسٹی سے تعلق کی وجہ سے کبھی کبھار بعض دفتری یا امتحانی امور تو ایسے آجایا کرتے ہیں جن کیلئے رازداری کی ذمہ داری بھی عائد ہو جایا کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مقبول نانا کے یہاں یہ حدود اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہوں۔ وہ زبردست رازداری برتتے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ بعض ہلکے پھلکے معاملات میں وہ رازدار رہنا بھی چاہیں تو نہیں رہ سکتے ہیں۔ جیسے پتہ چل گیا کہ ایک پرچہ پروفیسر مقبول صاحب کے پاس بھی ہے۔ ایک صاحبزادے یا ان کے والد محترم پہنچ گئے اور تعلقات کی زنجیروں یا آنسوؤں کی ڈور میں پروفیسر صاحب کو باندھ گئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد وہی حضرت تشریف لائے اور اس بار

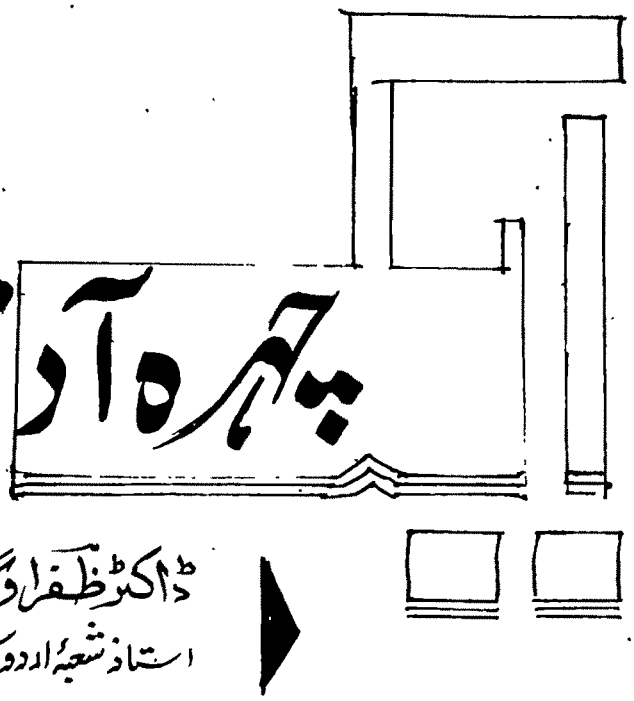

چہرہ آدمی

ڈاکٹر ظفر اوگانوی
استاذ شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسیٹی

نئے دور کی شناخت کرداروں کی سالمیت سے نہیں بلکہ شخصیت کے ریزہ ریزہ بکھر جانے سے عبارت ہے۔ اس لئے کہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں کے درمیان لٹکے ہوئے ہزار چہرہ آدمی کا دوہرا معیار ہندوستان کے بڑے شہروں سے نکل کر چھوٹے شہروں، قصبوں سے ہوتا ہوا اب گاؤں تک بھی پہنچا ہے۔ ایسے میں ماضی سے اپنے آپ کو جوڑے رکھنا یا ماضی کے قیمتی سرمایہ کو سمیٹ کر اپنے شخصی کردار کو بچائے رکھنا آج جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہیں ہے اور اسی دھندلکے میں پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب کی شخصیت بھی ایک مینار سے کم نہیں ہے

شاہ صاحب نے کلکتہ کے اردو حلقے کی جانے کتنی نسلوں کو علم و دانش کی تابندگی بخشی۔ مولانا آزاد کالج سے لیکر کلکتہ یونیورسٹی تک ان کی شاہراہِ فیض پر چل کر ہزاروں اپنی منزل پر پہنچے لیکن اس مینار کی جگمگاہٹ آج بھی کسی طرح کم نہیں ہوئی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ "ضرورتیں ختم رشتے ختم" کے موجودہ فارمولے کی ضربِ شدید سے جانے کتنے ریٹائرڈ اساتذہ گوشۂ گمنامی میں پڑے خود کو اور آنے والی نسلوں کو کوسنے کے وظیفہ میں مشغول اپنے آخری لمحہ کے منتظر ہیں۔ لیکن شاہ صاحب کو آج بھی اپنے ملاقاتیوں

دوسرا بند بڑی خوبصورتی کے ساتھ پہلے بند سے جڑا ہوا ہے۔ شاعر کی آواز میں ایک لہک ہے۔ کہتا ہے، شاید موت کا سماں ایسا ہوگا جیسے آخر شب صبح کی نمود ہوتے ہوتے حجرۂ محبوب میں ادھ کھلی کلیاں لہرانے لگیں اور جب رخصت کا وقت آئے تو ساز کے تمام تار مترنم ہو جائیں اور فضا میں موسیقی کی لہریں تیرنے لگیں۔

تیسرے بند میں "قزاق سناں دست" کا ذکر آیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا مصرع یاد آتا ہے۔ "قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ"۔ موت کسی حادثے اور ابتلا کا بھی نتیجہ ہو سکتی ہے جو ایک عالم پر مسلط ہو جائے۔ شاعر نے ایک رجائی لب و لہجہ اختیار کیا ہے جو تسلسل کے ساتھ آخری بند تک باقی رہتا ہے۔

موت خواہ "قزاق سناں دست" کی صورت آئے یا پیکرِ محبوب میں ڈھل کر آئے۔ شاعر بہر حال اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ مرتے وقت مومن کلمۂ توحید پڑھتا ہے شاعر بھی کلمہ پڑھ رہا ہے، لیکن

کلمۂ شکر بنام لبِ شیریں دہناں

ایسے ہی موقع پر مومن خاں نے کہا تھا۔

خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اس وقت وہ بدگماں نہ ہوا

کلام غالب اور اقبال کی تفسیر و تشریح نے اردو انتقادیات اور نتیجتاً اردو نثر کو اس صدی میں گمبھیر بنا دیا ہے اور اس کی سرحدوں میں نئی وسعتیں پیدا کی ہیں۔ راقم السطور یہ سمجھتا ہے کہ کلام فیض کے فنی، جمالیاتی اور فکری نکتے ارباب ادب سے شرح و تفسیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مطالبہ پورا ہو تو اردو نثر میں فن اور جمالیات کے نئے افق روشن ہوں گے۔

بے طلب پہلے پہل مرحمت بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے

شاید اس طرح کہ جس طور کبھی آخر شب
نیم وا کلیوں سے سرسبز سحر
یک بیک حجرۂ محبوب میں لہرانے لگے
اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگام رحیل
جھنجھناتے ہوئے تاروں کی صدا آنے لگے

کس طرح آئے گی کس روز قضا آئے گی
شاید اس طور کہ جس طور تہہ نوک سناں
کوئی رگ واہمۂ درد سے چلانے لگے
اور قزاق سناں دست کا دھندلا سایہ
از کراں تا بہ کراں دھر پہ منڈلانے لگے

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئیگی !
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف دعا کی صورت
کلمۂ شکر بنام لب شیریں دہناں

پہلے بند میں فیض نے جو استعارے استعمال کئے ہیں وہ نہایت دلکش اور رومان پرور ہیں۔ بوسۂ لب کا مرحمت ہونا، طلسمات کے در کھلنا۔ گلابوں کی بہار کی آمد، سینۂ مہتاب کی تڑپ، یہ استعارے شاعر کے جمالیاتی شعور اور تازگیٔ فکر کی دلیل ہیں جو موت کے سامنے بھی مرجھا نہ سکے۔ اخلاص و محبت جس کی زندگی کا تخلیقی عمل بن جاتی ہے۔ موت ان کے لئے دشوار نہیں ہوتی۔

Youth, Day, Old, Age, And Night

youth, large, lusty, loving—youth full of grace, force, fascination.

Do you know that old age may come after you with equal grace, force, fascination ?

Day full-blown and splendid—day of the immense sun, action, ambition, laughter.

The night follows close with millions of suns, and sleep and restoring darkness.

ترجمہ

جوانی ، دل غنی ، شہ زور ، پیار میں ڈوبی
جوانی ناز ، اثر پروری ، سحر کاری
جوانی کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرے بعد
ضعیفی آئے گی اور اس کے پاس بھی ہوگی
متاع ناز ، اثر پروری ، سحر کاری ؟
ہر ایک سمت اجالوں کی پرشکوہ طناب
یہ دن ہے چڑھتے ہوئے پروقار سورج کا
عمل کا ، جہد کا اور کھل کھلا کے ہنسنے کا
اور اس کے بعد اس دن کے اختتام کے ساتھ
کروڑوں مہر درخشاں کی رات آئے گی
جلو میں نیند کی مستی ، خمار خواب لئے
اندھیرا راحت دل ، جاں فزا ، سکوں پرور

اب فیض کی نظم ملاحظہ فرمائیں :-

کس طرح آئے گی کس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی اول شب

فیضؔ کی معرکۃ الآرا نظموں میں ان کی ایک نظم موت بھی ہے جو انہوں نے اپنے آخری ایام میں لکھی۔ یہ نظم صرف ہمارے ادب ہی میں نہیں، عالمی ادب میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

موت کے بارے میں میرؔ نے کہا۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

سوداؔ نے کہا تھا ؎

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

مظہر جانان کو سنئے ؎

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہرؔ
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہرؔ

ذوقؔ کا مشہور شعر جو زبان زد ہو چکا ہے ؎

فنا کیسی، بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے
کبھی اس گھر میں آ نکلے، کبھی اس گھر میں جا نکلے

چکبستؔ فرماتے ہیں۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اقبالؔ کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔

موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

اس موضوع پر چند مصرعوں (لائنز) پر مشتمل ایک خوبصورت، سادہ اور معنی خیز نظم جو عظیم ترین امریکی شاعر والٹ وھٹ مین (سن وفات ۱۸۹۲ء) کی لکھی ہوئی ہے ترجمے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

ہر نظر اک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے
موجِ خوں جب تک جواں رہتی ہے اس کا سرخ رنگ
جذبۂ مشوقِ شہادت، درد، غیظ و غم کا رنگ
اور تھم جائے تو کجلا کر
فقط نفرت کا، شب کا، موت کا
ہر رنگ کے ماتم کا رنگ
چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
جس سے وضو
کر لیں تو شاید دھل سکے
میری آنکھوں، مری گرد آلود آنکھوں کا لہو

۸ر اپریل ۱۹۷۱ء

بنگلہ دیش کے المیے نے جو زخم شاعر کے سینے پر لگائے تھے وہ تین سال بعد ایک بار پھر ہرے ہو گئے۔ ۱۹۷۴ء میں غزل کے پیرائے میں انہوں نے ایک نظم لکھی جس میں وہ بنگلہ دیش سے اس طرح خطاب کرتے ہیں۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزوں کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی!
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقے کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد!

مثالی بن گئی ہے۔ نظم میں نوجوان مجاہدین آزادی کی قربانیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی امنگوں اور خواہشوں کی پروانہ کرتے ہوئے آزادی کی راہ میں سرفروشانہ آگے بڑھتے رہے اس امید پر کہ

کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل

لیکن

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض کے نزدیک نجات دیدہ و دل کا نام "حریت" ہے۔ وہ سیاست سے نہیں، انسانیت سے قریب تر رہنا چاہتے ہیں۔ انقلاب بنگلہ دیش سے متاثر ہو کر انہوں نے جو نظم لکھی وہ رزمیہ نہیں بلکہ خون اور آنسوؤں سے لکھا ہوا ایک مرثیہ ہے۔ اسمیں کسی سیاسی لیڈر کے نعروں کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ نہ زور خطابت سے کام لیا گیا ہے اور نہ کسی خاص سیاسی مسلک سے وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ انسانی ضمیر کی آواز ہے جس میں ظلم اور تعصب کے خلاف ایک دلدوز احتجاج کی۔ صدا ہچکیوں کے درمیان سنی جا سکتی ہے۔ فیض نے انسانی قدروں کو سیاست کی تمام مصلحت کوشیوں پر مقدم سمجھتے ہوئے ایک انسان ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا جو ایک المیے کا مرثیہ ہے۔

نظم کا ایک حصہ سماعت فرمائیں۔

عالم موجود کی ہر ایک شے
مری آنکھوں کے لہو سے اس طرح ہم رنگ ہے۔
خورشید کا کندن لہو
مہتاب کی چاندی لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو
ہر شجر مینار خوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے

نظم کے پہلے بند میں شاعر نے بشارت دی ہے کہ چشمۂ مہتاب سے ابھی بھی دھل کے رات نکلنے والی ہے۔ اس کے بعد کچھ محبوب اور سراپائے محبوب کی باتیں ہیں اور پھر شاعر کہتا ہے۔

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے
یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ

اس کے بعد شاعر بتاتا ہے کہ کس طرح عوام دشمن طاقتیں انسانیت کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ اور کس طرح یہ زمین خوابوں کا مقتل بنی ہوئی ہے۔ نظم یوں ختم ہوتی ہے۔

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

فیضؔ کی بعض شاہکار نظمیں اپنے اندر ایمائیت اور استعارات کا بھرپور زور رکھتے ہوئے کسی دلدوز واقعے یا حادثے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً ان کی وہ شہرۂ آفاق نظم جو ۱۹۴۷ء میں "صبحِ آزادی" کے عنوان سے لکھی گئی۔ نظم ایک لافانی مصرعے سے شروع ہوتی ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

ایک مصرعے میں دو اچھوتے استعارات استعمال ہوئے ہیں جن سے مصرعے کی بلاغت

سرزمین پنجاب کو ہندوستان کے دیگر خطوں کے مقابلے میں زیادہ راس آئی۔ ہماری صدی کے عظیم ترین شاعر اقبال کی عظمت میں اس تحریک کا بھی حصہ ہے۔

احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، اختر شیرانی۔ ن۔م۔ راشد۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور فیض احمد فیض اس تحریک سے اگرچہ براہ راست منسلک نہیں تھے۔ لیکن اس تحریک کے شاندار نتائج ان کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے نظموں کی طرف خصوصی توجہ کی۔ ان کی نظمیں سپاٹ اور بیانیہ نہیں ہوتیں۔ انہوں نے حسیات کو اشاریت، رمزیت اور تمثیل کا لباس پہنایا ہے جو تسلسل اور ربط کی بنا پر بیانیہ بن گئی۔ ان کی غزلوں کا بھی یہی انداز ہے۔

میر نے اپنے بارے میں کہا تھا۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

میر سے پہلے ریختہ یعنی غزل اس مقام تک نہیں پہنچی تھی جہاں میر نے اس کو پہنچایا۔ کسی خاص صنف سخن سے وابستگی رکھتے ہوئے اس میں نیا پھیلاؤ اور نئی جہتیں پیدا کرنا جو دوسروں کے لئے راہنما ہوں یقیناً عظمت کی دلیل ہے۔

فیض کی نظموں کی صورت بھی کچھ اسی قسم کی ہے یا اعتبار ہیئت اور اسلوب ان کی نظمیں جدید اور تازہ ہوتے ہوئے اپنے اندر انفرادیت کی ایک شان رکھتی ہیں اور یہ جدت اور تازگی محض تفنن طبع کے لئے نہیں بلکہ ان کا رشتہ فطرت سے جڑا ہوا ہے جو ہر زمانے میں عظیم فن کا کلیہ رہی ہے۔

کلام فیض محض کسی طبع موزوں کی ترنگ نہیں۔ بلکہ اسکی تہوں میں ایک طے شدہ منظم متن کارفرما نظر آتا ہے جو اس کو معنویت کی گہرائی اور گیرائی عطا کرتا ہے۔

۱۹۴۱ء میں فیض کا پہلا مجموعہ کلام نقش فریادی شائع ہوا جبکہ انکی عمر ۲۹ یا ۳۰ سال کی تھی۔ موضوع سخن کے عنوان سے اس میں ایک نظم شامل ہے جس میں انہوں نے اپنے خاص شعری انداز میں گہرے اشارے کئے ہیں کہ زندگی کے آنے والے دنوں میں ان کے شعر و سخن کا موضوع کیا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ آئینہ ایام میں وہ اپنے وجدان کی آنکھوں سے سماجی حقائق کے اس ارتقاء کو دیکھ رہے تھے جو آئندہ پیش آنے والا تھا۔ نیز وہ اس حقیقت کا بھی اندازہ کر رہے تھے کہ ان کے جمالیاتی شعور کو حقائق کے اظہار میں کس طرح معاونت کرنا۔

فیضؔ کو رنگوں سے بڑا انس ہے صبح و شام کے سماں میں جو رنگ جھلکتا ہے اس کا ذکر وہ مختلف عنوانات سے کرتے ہیں۔ رنگِ حنا، رنگِ شفق، رنگ شراب، چمپئی رنگ سُرمئی رنگ ان کے محبوب رنگ ہیں۔ رنگوں کی مدد سے بسا اوقات وہ غیر مرئی صفتوں کو بھی پیکر بخش دیتے ہیں۔

مثلاً راحت دیدار کو اک شکل دے دی جائے تو اس کا کیا رنگ ہوگا۔ "چمپئی رنگ" ہوگا۔ کہتے ہیں ؎ چمپئی رنگ کبھی راحت دیدار کا رنگ

ساعتِ بیزار کو کون سا رنگ دیا جائے۔ فرماتے ہیں۔

سُرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا خس و خار کا رنگ

عصری شاعری میں یہ استعارات بالکل نئے اور اچھوتے ہیں جو غالبؔ کی قوتِ اختراع کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

آمدِ محبوب کے بعد جو کیفیت پیدا ہوئی تھی اب نظم کے آخری حصّے میں شاعر اسکی مزید تفصیل پیش کرتا ہے۔

آسماں کوئی بھیگا ہوا دامن
راہ گزر کوئی دکھتی ہوئی رگ اور شیشۂ مے
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے۔

آخر میں شاعر اپنے محبوب سے التجا کرتا ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے
پھر سے ایک بار ہر چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر، شیشۂ مے، شیشۂ مے

کرنل ہالرائیڈ کے ایما پر مولانا محمد حسین آزادؔ کی سرکردگی میں مجلس مناظمہ کا جو اہتمام لاہور میں کیا گیا تھا اس نے اردو کے شعری ادب کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔ اور وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی اس میں جرأت پیدا کی۔ نظم نگاری کی یہ تحریک

غالبؔ نے گداختگیٔ عشق اور بے تابیٔ تمنا کا ایک مضمون باندھا ہے جس میں جگر خون ہوتا دکھائی پڑ رہا ہے اور دلِ ناصبور کے تڑپنے کا انجام اپنی انتہا کی طرف جا رہا ہے۔ فیضؔ صاحب نے خونِ جگر ہونے تک کی ترکیب کا سہارا لیکر "ملاقاتِ محبوب" کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

رنگ ہے دل کا مرے خونِ جگر ہونے تک

محبوب کی آمد سے پہلے آسمان ایک حدِ نظر کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ راہ گزر محض راہ گزر اور شیشۂ مے کی خیثیت محض شیشۂ مے کی تھی۔ جس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یعنی یہ تمام چیزیں فرسودہ تھیں۔ لیکن اب جب کہ محبوب آگیا ہے ہر چیز میں وہ نادیدہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کے اظہار کی کسک کا اعلان غالبؔ کے اس مصرعے میں ہوا ہے۔

دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

غالبؔ نے پوچھا تھا جگر کے خون ہونے تک دل کا کیا رنگ کیا جانا چاہیئے۔
فیضؔ کہتے ہیں:-
محبوب کی آمد کے بعد شیشۂ مے، راہ گزر، رنگِ فلک کی جو کیفیت ہے وہ ان کے دل کی کیفیت ہے۔

رنگ ہے دل کا مرے خونِ جگر ہونے تک

آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ
دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا آہستہ
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

دوسری نظم ملاحظہ فرمائیے۔

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گذر، راہ گذر، شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہ گذر، رنگِ فلک
رنگ ہے دل کا مرے "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو کا رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہ گزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے
اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے
پھر سے اک بار کہو ایک ہی چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر، راہ گزر، شیشۂ مے شیشۂ مے
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشہ و جام، صراحی ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ
دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا آہستہ
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

پوری نظم میں خواب کی سی رومانی کیفیت جاری و ساری ہے۔ تغزل نے ایک فضا پیدا کر دی ہے جس میں سادگی کے ساتھ قوسِ قزح کا رنگ رچا ہوا ہے۔ نظم میں روایاتی تغزل کی ترکیبیں فراوانی سے استعمال ہوئی ہیں لیکن اس انداز سے کہ ان میں تازگی اور ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ بندِ قبا، فارسی اور اردو شاعری کی ایک فرسودہ ترکیب ہے لیکن جب شاعر کہتا ہے سینۂ مہتاب سے بندِ قبا کھلا تو تازگی اور رعنائی کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو رہ گزر، سائے، شجر، حلقۂ بام سب کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیتی ہے۔ فضا کا رنگ نیلا ہو جاتا ہے۔ شاعر نے استعارتاً فضا کو سیالوں کا ٹھہرا ہوا نیل کہا ہے۔ اور فضا گویا نیل کی جھیل ہے۔ ایک پتہ کسی شاخ سے ٹوٹا حباب کی مانند، تھوڑی دیر اس جھیل میں ٹھہرا اور پھر پھوٹ گیا۔ یعنی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ نظم ۱۹۶۴ء میں ماسکو میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم میں وہاں کے منظر کی بھی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ آخری مصرعوں میں شاعر نے جس منظر کو لفظوں کا پیکر بخشا ہے۔ وہ جانِ غزل ہے۔

شیشہ و جام صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش

کو اردو کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کر لیں تو باور کرنا پڑے گا کہ اردو شاعری کا آغاز غزل سے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مثنوی کے علاوہ نظم کی مختلف اصناف مثلاً مخمس، مسدس ترجیع بند وغیرہ غزل سے نکلیں اور غزل بذات خود قصیدے سے نکلی۔ اردو میں آزاد نظموں کا رواج انگریزی کے زیر اثر ہوا۔ اور ترقی پسند تحریک نے اس کو ایک معتبر صنف بنا دیا۔ اردو کے کلاسیکی شعراء اور اساتذۂ فن کے یہاں آزاد نظموں کی کوئی روایت نہیں ملتی۔

کسی بھی صنف کلام کی ترقی عظیم شعراء کی کاوشوں کی رہین منت ہوا کرتی ہے۔ اساتذۂ فن مروجہ نظام عروض سے انحراف کرنا شاعری کے حق میں ایک خطرناک اقدام تصور کرتے تھے۔ انہوں نے تاکید کی کہ نظام عروض کی پابندی ضروری ہے کیونکہ وہ ہماری شاعری کی اساس ہے۔ چنانچہ عہد اقبال تک آزاد نظموں کا کوئی قابل اعتنا نمونہ سامنے نہیں آتا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کچھ باعزم نوجوان شاعروں نے جن میں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین ن۔م۔ راشد، سلیمان اریب، علی سردار جعفری، ساغر نظامی، ظہیر کاشمیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آزاد نظموں کو اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیتوں کا مرکز بنایا۔ اور اعلیٰ پایہ کی نظمیں لکھیں جو ہماری صدی کی اردو شاعری کا قابل ذکر سرمایہ ہیں۔

فیض کی نظمیں خواہ آزاد ہوں یا پابند اپنے اندر غزل کا بھرپور آہنگ اور نغمگی رکھتی ہیں۔ وہ غزل کی روایت سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے۔ زبان کی لطافت اور رنگ تغزل ان کی نظموں میں رچا بسا ہوا ہے۔ انکی نظر زبان کے طبعی مزاج کی طرف ہوتی ہے جس کی وجہ سے کلام میں ایک رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

دست تہ سنگ کی آخری نظم ملاحظہ فرمائیے۔

رہ گزر، سائے، شجر، منزل در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا آہستہ!
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتے کا جواب

ڈاکٹر عبدالرؤف

پھر پئے نذر دیدہ و دل لیکے چلو
حسن کی مدح کرو شوق کا مضمون لکھو
دشت و صحرا میں صبا پھرتی ہے یوں آوارہ
جس طرح پھرتے ہیں ہم اہل جنوں آوارہ
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر
مرے تنزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن، نہ کوئی جام بھرے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی، یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شور محشر یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

لگتا ہے یہ اشعار غزل کے ہیں، دراصل یہ اشعار فیض کی نظموں کے ہیں جن میں سے بعض قافیہ و ردیف سے بے نیاز اور بعض آزاد اور مختلف الاوزان ہیں۔ غزل کے انداز خاص کی وہ روایت جس کو مومن خاں مومن کی ایجاد پسند طبیعت نے ایک مکتبۂ فن بنا دیا تھا جس کی نمائندگی کے علمبردار اس صدی میں مولانا حسرت موہانی تھے فیض احمد کا شیفتہ فنی اعتبار سے اس خاص مکتبۂ فن سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ اگر ہم امیر خسرو دہلوی

اداریہ

گذارشات

یونیورسٹی میگزین کا دوسرا شمارہ آپ کے پیش خدمت ہے۔ اس شمارے کو اس سے بہت پہلے آپ تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ بہرحال تاخیر ہوئی۔ کشاکش حالات اور کوتاہیوں سے مفر کہاں؟ اردو کا دور ابتلا کب سے شروع ہوا یہ تو بتانا مشکل ہے لیکن گذشتہ دو برسوں میں سانحات نے جو سرعت اور شدت اختیار کر رکھی ہے اس سے اس دور کے طول و عرض کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فراق بیدی اور فیض احمد جن سے اس صدی کی شناخت ہوتی ہے، ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ رگھوپت سہائے فراق اور راجندر سنگھ بیدی کی شخصیتیں اردو کے اس دعوے کو تقویت پہنچاتی تھیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے، لیکن ان کے بعد اردو کا یہ دعویٰ اعتماد کھو کر اپنی نفی کرتا نظر آ رہا ہے۔ غزل کو جدید آہنگ اور زبان اردو کو ایک بین الاقوامی حیثیت بخشنے میں فیض احمد فیض کی خدمات مسلم ہیں

مقامی ادیبوں اور شاعروں میں حضرت رضا مظہری اور جواں سال خوش فکر شاعر اور ادیب خواجہ وحید الحق عرشی ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ حضرت رضا مظہری اس دور کے آخری نمائندہ تھے جو حضرت رضا علی وحشت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ نکات فن اور فیض سخن کو عوام تک پہنچانے میں اس دور نے جو خدمات انجام دیں۔ اسکی تقلید کا حق ادا کرنا ایک دشوار امر ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ ہم میں دکھائی نہیں دیتا۔ خواجہ وحید الحق عرشی ضلع ۲۴ پرگنہ کے ایک صنعتی علاقہ کانکی نارہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سماجی اور سیاسی طور پر نظر انداز کئے ہوئے علاقے کو اردو کیلئے شاداب اور زرخیز بنانے میں انہوں نے اپنی جوانی کا گرم لہو صرف کیا۔ خدائے پاک انکی کاوشوں کو بار آور کرے۔

اردو ماہناموں اور رسالوں کی اشاعت کے باب میں کلکتہ جیسا وسیع شہر پہلے بھی تنگ تھا اور اب صورتحال تمام تبصروں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے مختلف شعبے اپنے میگزین شائع کرتے ہیں جنکی اشاعت کی کفیل یونیورسٹی ہوتی ہے۔ اردو کو بھی یہ رعایت حاصل ہے۔ یونیورسٹی اور شعبۂ اردو کے تعاون سے یہ رسالہ اپنی اشاعت کے دوسرے شمارے تک پہنچا۔ اردو کے ضمن میں یونیورسٹی نے ایک روایت قائم کی ہے جو اپنے استحکام اور درازیٔ عمر کیلئے آپکی دعاؤں کی طالب ہے۔

عبدالرؤف صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی

۱۹/۲/۱۹۸۶ء

ترتیب مضامین

			صفحہ
ڈاکٹر عبدالرؤف	اداریہ	گذارشات	۳
" " "		فیض کی نظمیں	۴
ڈاکٹر ظفر اوگانوی		ایک چہرہ آدمی	۱۸
ڈاکٹر عبدالمنان		بیدی کی کہانی	۲۷
پروفیسر مشتاق احمد		صغریٰ سبزداری حیات و کارنامے	۳۱
پروفیسر شاہ مقبول احمد		تاباں کلکتوی (مرحوم)	۴۰
ڈاکٹر جاوید نہال		بنگال میں اردو کا لسانی ارتقاء	۴۳
شمیم انور ایڈہاک لکچرر کلکتہ یونیورسٹی	(نظم)	دو نظمیں	۴۷
ایم علاؤالدین ایم اے۔ سال دوم		منٹو کا فن	۴۸
سید حسن امام سال اول		مرشد آباد کا ایک صاحب دیوان شاعر	۵۱
فہمیدہ بیگم۔ ریسرچ اسکالر		اقبال اور عورت	۵۵
خواجہ وحید الحق عرشی (مرحوم)	(نظم)	درد	۶۱
ڈاکٹر طیبہ صدیقی		مرزا غالب اپنے معاصرین کی نظر میں	۶۲

نیو ایشین پرنٹرس

۲۹/۷۔ فیرس لین۔ کلکتہ۔ ۷۳

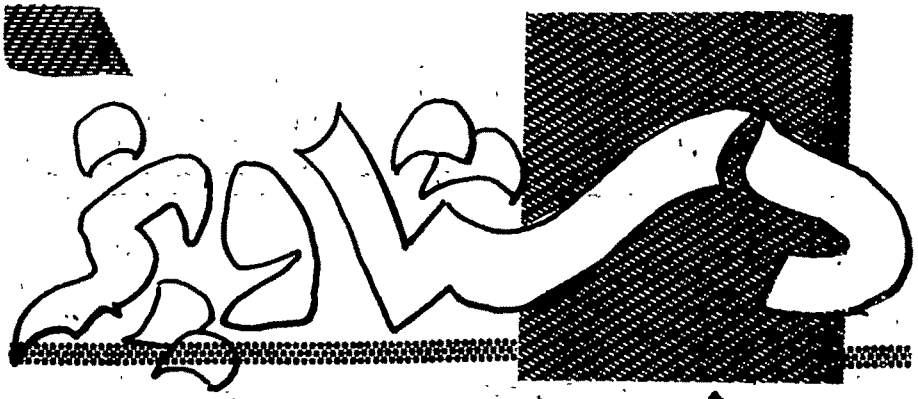

شعبۂ اردو
کلکتہ یونیورسیٹی کا
تحقیقاتی اور ادبی مجلہ ـــ سال میں ایک بار

۱۹۸۴-۸۵ء

نگراں

ڈاکٹر عبدالرؤف

ادارۂ تحریر

- ڈاکٹر عبدالرؤف
- ڈاکٹر ظفر اوگانوی
- ڈاکٹر عبدالمنان
- پروفیسر مشتاق احمد
- پروفیسر شاہ مقبول احمد
- ڈاکٹر جاوید نہال

دستاویز

CALCUTTA UNIVERSITY LIBRARY

۱۹۸۴-۸۵

مجلّہ-۲

UNIV OF CALCUTTA DEPARTMENT OF LIBRARY

NOV 1986

شعبۂ اُردو کلکتہ یونیورسیٹی